سخن گفتن و بکر جان سفتن است
نہ ہر کس سزائے سخن گفتن است

محبوب الشعراء

مؤلفہ و مرتبہ

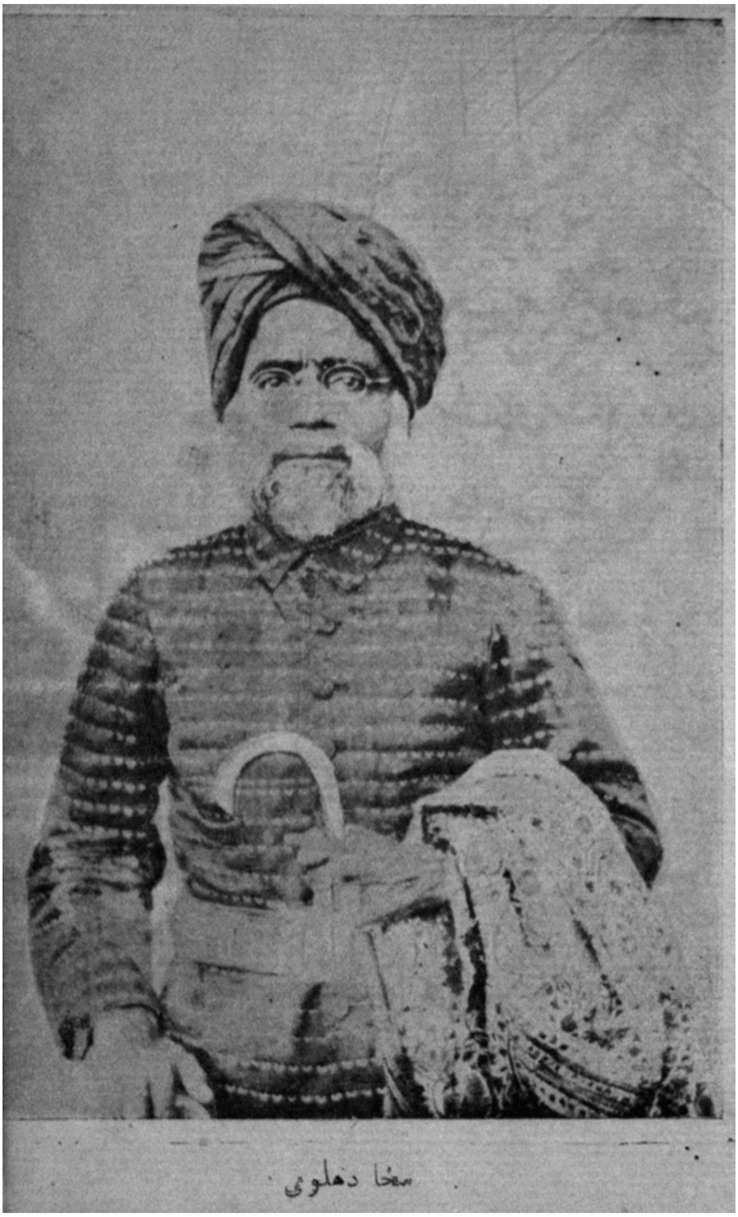
سید نظیر حسن سخا دہلوی تلمیذ فصیح الملک
حضرت داغ دہلوی

پبلشر
دفتر فاضل مقبل دہلوی نے باہتمام سخا پبلشنگ ہاؤس دہلی شائع کیا

پہلے دونوں ایڈیشن نواب میر محبوب علی
خاں بہادر خلد آشیاں شاہِ دکن
کے نامِ نامی سے معنون تھے

پہلا ایڈیشن سنہ ۱۸۹۷ء ..... ایک ہزار
دوسرا ایڈیشن سنہ ۱۹۰۰ء ..... ایک ہزار

(مطبوعہ انصاری پریس دہلی)



سخا دہلوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قصیدہ

بمدح اعلیحضرت مظفر الملک والممالک فتح جنگ نواب میر محبوب علیخان بہادر نظام الملک آصف جاہ سادس رح

ہے فیضِ بہاراں سے چمن طارمِ اخضر — نسریں ہے یہاں نور فشاں چرخ پہ اختر

مہتاب سے ہمچشم کہیں نرگسِ شہلا — خورشید سے ہم بزم کہیں لالۂ احمر

پرجوش کسی شاخ پہ قمری و عنادل — ہمدوش کسی نہر پہ شمشاد و صنوبر

رضواں بھی اگر آئے تو حسرت سے بتائے — یہ حور یہ غلماں ہے یہ طوبیٰ ہے یہ کوثر

پھولوں کی یہ کثرت ہے کہ العظمت للہ — نسریں پہ ہے نسریں کہیں نستر پہ ہے نستر

شبو پہ ہے شبو کہیں نرگس پہ ہے نرگس — سوسن پہ ہے سوسن کہیں عبہر پہ ہے عبہر

کلغہ پہ یہ کلغہ نہیں آتش پہ ہے آتش — لالہ پہ یہ لالہ نہیں اخگر پہ ہے اخگر

شبنم پہ یہ شبنم نہیں کوکب پہ ہے کوکب — قطرہ پہ یہ قطرہ نہیں اختر پہ ہے اختر

گلزار کو یوں دیکھتا ہے ابرِ گہربار — محتاج کو جس طرح سے مغرورِ تونگر

یہ شعلۂ جوالہ ہے یا رب کہ شقائق — یا دستِ حنابستۂ معشوق میں ساغر

سبزہ متلاطم نہیں جنبش میں ہیں گردوں — شاخیں متمائل نہیں گردش میں ہیں اختر

یہ لالۂ خودرو ہے کہ لشکر میں علمدار — یہ سرو لبِ جو ہے کہ افواج میں افسر

یاں بیلا ہے اور سیوتی بیلے کے مقابل
واں چمپا ہے اور جعفری چمپا کے برابر

اِک سمت چمیلی ہی چمیلی ہے سراپا
اِک سمت ہزارہ ہی ہزارہ ہے سراسر

گلشن میں گل طرۂ گل طرہ پہ شبنم
گردوں پہ شفق زار شفق زار میں اختر

مطرب کو یہ تہدید ہے گا نغمہ پہ نغمہ
ساقی کو یہ تاکید ہے ساغر پہ دے ساغر

اِک نغمہ کا ارماں ہے یہ ہو کہ دھرپت
اِک جرعہ پہ قرباں ہیں زمزم ہو کہ کوثر

ہم رنگ ہے اسد رجہ خیاباں سے خیاباں
ہم شکل ہو جس طرح برادر سے برادر

مستی کی یہ حالت ہی گری پڑتی ہے ہر سُو
شمشاد پہ شمشاد صنوبر پہ صنوبر

دنیا ہے کہ مصروف ہے گلگشتِ چمن میں
قاضی ہے نہ مفتی ہے نہ دلواں ہی نہ دفتر

بوسہ پہ ہے بوسہ کہیں دشنام پہ دشنام
تلخی پہ ہے تلخی کہیں شکر پہ ہے شکر

وعدہ پہ ہے وعدہ کہیں انکار پہ انکار
مرہم پہ ہے مرہم کہیں نشتر پہ ہے نشتر

کرسی پہ بُتِ سادہ بُتِ سادہ پہ جوبن
چوکی پہ لبِ یادہ لبِ بادہ پہ ساغر

قمری کہیں قمری سے ہے گلشن میں نوا سنج
طوطی سے ہے طوطی کہیں سبزہ میں نوا گر

نہروں میں بطیں تیرتی ہیں حوض میں قازیں
تالاب میں بگلے ہیں درختوں پہ کبوتر

گلزار میں سرخاب ہیں اشجار پہ طاؤس
باغات میں بُلبُل ہیں مضافات میں تیتر

نہروں میں نمودار ہے اشجار کا سایہ
معلوم نہیں آبِ رواں ہے کہ مشجّر

مچھلی پہ قلابازیاں کھاتے ہیں دھما دھم
غوّاص پہ غوّاص شناور پہ شناور

واعظ بھی نہ بھولے سے کہیں راہ پر آجائے
ایسا نہ ہو در کار ہو رہبر کو بھی رہبر

اک سمت حسینانِ پری چہرہ پری رُو اک سمت جمیلانِ جفاکیش و جفاگر
اطلس کی قبا اور بھی خوبی پہ ہے خوبی شوخی میں حیا اور بھی زیور پہ ہے زیور
عاشق سے دغا اور بھی آفت پہ ہے آفت غیروں سے دغا اور بھی محشر پہ ہے محشر
آراستہ ہر دو طرف پہ کیا گیسوئے پیچاں آویختہ آغوش میں کیا زلفِ معنبر
پھیلے تو شبِ تار ہے بل کھائے تو زنّار سمٹے تو سیاہ مار پریشاں ہو تو اژدر
افشاں کے ستارے نہیں انجم یہ ہیں انجم مژگاں کے اشارے نہیں خنجر یہ ہیں خنجر
تھمتے ہیں تو تھمنے میں ہے آشوبِ قیامت چلتے ہیں تو چلنے میں ہیں ہنگامۂ محشر
آثار یہ کہتے ہیں کہ نوروز ہے نوروز اطوار یہ کہتے ہیں غلط بلکہ غلط تر
محبوب علی خان بہادر کے کرم سے ذرّے ہیں قمر شام سحر خار گلِ تر
شبنم ہے گہر باغِ ارم دشتِ گلستاں روباہ اسد کبک ہما باز کبوتر
اے شاہِ دکن فخرِ زمن آصفِ دوراں بہرام سما ماہ سمک مہر مظفر
گنجینۂ دیں کنزِ یقیں خازنِ ایماں گلستانِ اماں درعِ زماں جوشنِ کشور
ایمانِ سخن جانِ زباں کانِ فصاحت سحبانِ زماں بحرِ بیاں رشکِ سکندر
شمعِ خرد و نورِ ذکا لمعۂ دانش مصباحِ حشم ضوءِ خدم شعشعۂ فر
دیواں میں غزل اور تری غزلوں میں مضامیں گلشن میں درخت اور درختوں میں گلِ تر
مضموں میں نکات اور پھر اُن نکتوں میں خوبی صندوق میں درج اور پھر اُس درج میں گوہر
حقا کہ ترے نام سے آرائشِ خطبہ واللہ کہ تری ذات سے زیبائشِ منبر

مرقوم ترے دل پہ روایاتِ ائمہ   منصور تری ذات سے رایاتِ پیمبر
یوں تجھ میں نمایاں ترے آبا کے فضائل   جیسے خمِ شمشیر میں فولاد کے جوہر
بھرتا ہے تری حرب کا دم شورِ قیامت   ڈرتا ہے تری ضرب سے ہنگامۂ محشر
گر تو ہو خطا پوش تو گردوں ترا خادم   گر تو ہو عطا کوش تو جیحوں ترا چاکر
تو کیا ترے خدام کے اقبال سے ہو جائے   ماقبل کا مابعد مقدم کا مؤخر
گر بذل ردا ہے تو ترے دوش کے لائق   گر فضل قبا ہے تو ترے قد کے برابر
اللہ رے انصاف کہ تاکید ہوئی ہے   عاشق سے کبھی بل کی نہ لے زلفِ معنبر
حیراں ہے ترے قصر میں قیصر ہو کہ فغفور   لرزاں ہے ترے عصر میں خاقاں ہو کہ سنجر
پایہ تری کرسی کا ہے افلاکِ کواکب   سایہ تری چھتری کا ہے خورشیدِ منور
کوئی گر آمادۂ پیکار ہو تجھ سے   اب اس میں تہمتن ہو کہ سہراب کہ نوذر
قسمت کہے موت آئی ہے مرنے کو چلا ہے   زندہ کبھی آئے گا نہ کمبخت پلٹ کر
بلکہ اسے مرقد ہی سمجھ کر کہے دنیا   یہ خود ہے یا برج زرہ ہے کہ مُحجّر
عالم ترے انصاف کی صیقل سے مُجلّیٰ   دنیا ترے اخلاق کی خوشبو سے معطّر
ایوانِ مراعات میں تو خُلقِ مجسّم   میدانِ مضافات میں تُو قہرِ مصوّر
یہ مہر نہیں مطبخِ عالی سے فلک کو   ہر روز عطا ہوتی ہے بشقابِ مزعفر
گر قلبِ منوّر میں قمر جلوہ نُما ہو   اس درجہ پریشاں ہو کہ خورشید سے شپّر
دشمن کو اجل شربتِ مرگ آ کے پلائے   حملہ میں اگر تو کہے یا ساقیِ کوثر

جب تُو ہو عدالت میں ندامت زدہ کسریٰ
جب تُو ہو سیاست میں خجالت زدہ قیصر

اعلیٰ ہے بلیناس کی تدبیر سے تدبیر
بالا ہے سکندر کے مقدّر سے مقدّر

فریادرسا چارہ گرا داد ستانا
تجھ سا سخن سنج جہاں میں نہ سخنور

مخفی نہیں جس پایہ کا لکھا ہے قصیدہ
تاہم مجھے امید نہیں یہ کہ مقدّر

اُس بزمِ فلک فر میں کسی دن اُسے لے جائے
یہ شاہدِ معنی ہے مگر سوختہ اختر

پھر اُس پہ یہ طُرّہ کہ ہو منّت کشِ دربان
ناحق ہے فلاکت میں دماغ اُس کا فلک پر

تیرا ہی اگر جذبِ کرم کھینچے تو کھینچے
اِس شبنمِ ناچیز کو اے مہرِ منوّر

ورنہ مجھے دو لاکھ برس تک نہیں اُمید
جنّت کی ہوا کھائے مِرا چشمۂ کوثر

محتاج ہوں تو غم نہیں محتاج تھے ابرار
مفلس ہوں تو کیا عیب ہے مفلس تھے پیمبر

کیا کم ہے یہ دولت کہ اگر بزم کی تصویر
کھینچوں تو بنے نونِ سخن نقشۂ ساغر

کیا کم ہے یہ صولت کہ اگر رزم کی تفصیل
لکھوں تو اُٹھے سینِ سخن صُورتِ خنجر

گردوں سا جفا جو نہ کوئی مجھ سا جفا کش
میں اُس سے تعجب میں وہ مجھ سے متحیّر

ہمّت متقاضی ہے سخا صرفِ دعا ہو
آمادۂ آمیں ہیں ملک عرشِ بریں پر

شیرازۂ جمعیتِ احباب ہو مجموع
مجموعۂ آرام بد اندیش ہو ابتر

تا خرقۂ زُہّاد کی عزّت پہ ہو عزّت
سرکار کے احباب موقّر ہوں موقّر

تا فرقۂ حسّاد کی ذلّت پہ ہو ذلّت
سرکار کے بدخواہ محقّر ہوں محقّر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بلاغت

بلاغت تین علموں کے مجموعہ کا نام ہے علم معانی، علم بیان، علم بدیع۔ بعض مؤلفین نے عروض و قافیہ بھی آخر کتاب میں بطور ضمیمہ شریک کر دیا ہے۔ عربی میں بلاغت کی دو کتابیں مشہور اور زیر درس ہیں۔ ایک مطول دوسری مختصر معانی جن کو اصل میں ایک ہی سمجھنا چاہئے اور فارسی میں حدائق البلاغت اور دو ایک قدیم کتب ہیں اردو میں حدائق البلاغت کا ترجمہ اور معیار البلاغت اور بعض کتب کے ابواب ہیں۔ اور جس ترتیب سے میں نے ذکر کیا ہے اسی ترتیب سے ان کا رتبہ بھی سمجھنا چاہئے۔

شاعری

اس زمانہ میں کیا بلکہ ہر زمانہ میں عشق، حسن، شباب، پیری، ہوشیاری، دیوانگی، وصال، فراق، گلستاں، بیاباں، سفر، حضر، مصیبت، راحت، کامیابی، ناکامی، امید، یاس اور انسانی جذبات اور دنیاوی حادثات ہمیشہ سے تھے اور ہمیشہ رہیں گے۔ اس لئے شعر و شاعری بھی انہیں کے ساتھ رہی اور رہے گی۔ پہلے قواعد منضبط نہ تھے اب منضبط ہو گئے۔ مذاق بدل گیا۔ کچھ ترمیم و تنسیخ بھی ہوئی۔ غرض ہر طبقہ بیکار نہ بیٹھا اس

کوٹھی کے دھان اس کوٹھی میں کرتا ہی رہا اور اس سلسلہ میں کچھ تجارت بھی ہوتی رہی اور ترمیم میں تو نہ کسی کے ارادہ کو دخل ہے نہ مشورہ کی ضرورت زمانہ کے خواص میں سے یہ بھی ایک خاصہ ہے جس کا جلوہ ہر چیز میں زمانہ کا رنگ بدلنے کے پردہ میں حدوث کا ثبوت دے رہا ہے اور بجز ذاتِ باری کے کوئی شے بعینہ ایک حال پر قائم نظر نہیں آتی بہت سی باتیں اگلوں نے اچھی سمجھیں۔ اب ہمارے متروکات کی فہرست میں داخل ہیں۔ بہت سے سکے ہم رائج سمجھتے ہیں۔ آنے والی نسلیں ٹکسال باہر کر دیں گی۔ اچھا اور بُرا حقیقت میں تو خدا جانے کیا ہے مگر مفروضات کا اس محکمہ پر زیادہ اثر اور دباؤ ہے علم ملک، زبان، حکومت، مذہب، ضرورتِ مناسبت وغیرہ وغیرہ کے لحاظ سے سوسائٹی جس کو پسند کرے وہ مقبول اور اس کے سوا سب مردود ہے۔

اقبال مند جو چاہیں سو کریں۔ نہ اُن تک دستِ ملامت دراز ہو سکتا ہے نہ زبانِ اعتراض۔ کیونکہ نہ وہ کمال کے دعوے دار نہ پیشہ کار۔ اُن کو شوق کے میدان میں قواعد کے گڑھے کرنے کیا ضرور ہیں۔ کہ ہر وقت دیکھ کر چلنا پڑے۔ دوسرے یہ کہ جن مضامین کو ہم بڑی تلاش سے خیال میں لاتے ہیں بمراتب اُس سے زیادہ ہر وقت اُن کے پیشِ نظر رہتے ہیں اور اسی لئے عشرت کے مضامین شاہوں کا حصّہ اور فقر و فاقہ کے مطالب غربا کا ترکہ اور ورثہ ہے۔ اور صرف غزل کہنے والوں کو

یہی معمولی علمیت معمولی فن کی واقفیت کافی ہے زیادہ جگر کاوی کی ضرورت نہیں اگر زیادہ ہو بہتر ہے نہ ہو تو خیر مگر شاعری کے دریا کے غوطہ خور وادرائے ہر قسم وسخن کے طالب ہو اگر ہر میدان میں حریف سے مقابلہ کرنا چاہتے ہو تو اس درجہ نرمی اور آسانی سے اس منزل کا طے ہونا ممکن نہیں ہے۔ بڑے آدمیوں کی برابری فضول ہے ان کا ایک اقبال ہزار کمال کے برابر ہے جس فن کو سیکھتے ہو اس کے قواعد سیکھو۔ نہ جاننے والا مشاق بھی اپنی سلیم طبیعت اور ذہانت کے ذریعہ سے تجربہ کار بڑھیا کی طرح علاج کر لیتا ہے اور خاص امراض میں حکیموں سے بازی لے جاتا ہے مگر باقاعدہ حکیم کو نہیں پہنچتا اگرچہ چند مریضوں کو شفا بھی ہو جائے۔ تاہم کبھی دھوکا بھی کھا جاتا ہے اور یہ نہ جاننا کیسی بے لطفی ہے کہ جو اچھا ہوا وہ کیوں اچھا ہوا۔ اور جو اچھا نہ ہوا وہ کیوں۔ ان امور کا نہ جاننا حکیم کے لئے کیسی نقص اور تشویش کی بات ہے۔ یہ بے چارہ تو برابر دردِ سر میں صندل ہی بتائے جاتا ہے شفا ہو یا نہ ہو۔ اور جس دن روغنِ دارچینی کے عوض ہرے دھنیے کا عرق پیشانی پر لگا دیا اس جگہ موت کا قائم مقام ثابت ہوا۔ اسی طرح بلاغت سے ناواقف شاعروں کا حال ہے آدھی رات کو آنکھ کھلی بیلو گانے لگے۔ دوپہر کو سوتے اُٹھے کا لنگڑا اُڑانے لگے۔ پانی چھما چھم پڑ رہا ہے ہولی گا رہے ہیں۔ گرمی کا تڑاقا ہے ملہار گنگنا رہے ہیں کہنے بیٹھے رباعی وزن

ہوگیا قطعہ کا۔ لکھا قصیدہ اور تشبیب میں اُونچی چولی نیچی کرتی دھانی دوپٹہ سجا رہے ہیں۔ واہ معقول گھر کا مصالحہ دربار میں پیش ہوتا ہے لکھیں گے نعت بن جائے گی حمد لکھیں گے نعت ہو جائے گی ایک عامیانہ بات اور جو قصیدہ لکھا سبحان اللہ کچھ معشوق کی تعریف کچھ حمد کچھ نعت کچھ گستاخیاں کچھ متفرق خرافات غرض خرمن شاعری کا "ست نجا" لے کر ممدوح پر تصدق کرنے کو چلے۔ پھر اخبار میں بھی چھپتا ہے۔ سلامتی سے دیوالی کے حصہ کی طرح گھر گھر بھی بٹتا ہے اللہ اللہ۔

این چہ شوریست کہ در دورِ قمری بینم

ناسخ مرحوم اور ذوق مغفور نے جب کتب خانے کے کتب خانے چاٹ لئے تو دیوان لکھے۔ ہم فقط اُن کے دیوان ہی کو دیکھ کر ان کا جواب لکھنے کو تیار ہیں۔ میرے اُستاد میرے واجب التعظیم میرے سلطان الشعراء بلبل ہندوستان نواب فصیح الملک بہادر حضرت داغ دہلوی مدظلہ کا دیوان کا ایک جواب لکھا گیا ہے اس کا فیصلہ یہی کافی ہے کہ سالک نے جواب سمجھا یا نہیں اس کی شعراء میں کتنی خواہش اور مانگ پیدا ہوئی اور کے بار چھپا۔ اب ان سوالوں کا جواب خود ہی معلوم ہو رہا ہے۔ تماشہ یہ ہے کہ حریفوں سے جب کہا کہ پیر و مُرشد آپ کا شعر از حد عمدہ ہے لیکن جس شعر کا یہ جواب ہے اس کا مطلب میں نہیں سمجھا سمجھا دیجئے تو پورا لطف آئے۔ مگر بجز سکوت اور حیرت کے جواب نہ آیا۔ ہائے تمجا

اَلَمْ تَرَ کَیْفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِاَصْحٰبِ الْفِیْلِ اور کہاں اَلْفِیْلُ مَا الْفِیْلُ لَہٗ خُرْطُوْمٌ طَوِیْلٌ۔ یا اِنَّا اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ۔ فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَ انْحَرْ۔ یا اِنَّ شَانِئَکَ ھُوَ الْاَبْتَرُ۔ ایک صاحب اس کا جواب یوں فرماتے ہیں:۔ یا ایہا الاکبر لا تا کل البقر لان فیہ ضرر۔ سچ ہے ایک سے ایک زبردست ہے یاروں نے خدا کے کلام کو بھی لاجواب نہ چھوڑا حضرتِ داغ تو پھر کس شمار میں رہے اور معلوم ہوا کہ جواب نویسی قدیم رسم ہے۔

تمہیں نے داغ نرالے نہیں اٹھائے ستم
سلف سے یوں ہی مرے یار ہوتی آتی ہے

حضرت کیا آپ ہی سلطان الشعراء بن گئے یا خود ہی فصیح الملک نام رکھ لیا۔ قصائد میں خاقانی انوری کا رنگ کہاں سے آیا۔ آیات کا اقتباس کس نے سکھایا۔ واللہ بے علم تو کیا ذرا کم علم بھی ہوتے تو اُن کے فاضل شاگرد دیکھ کے بیعت توڑ کر اپنی اپنی راہ لگے ہوتے اور مجھ سے بھلے مانس کو تو سترہ اٹھارہ برس تضیعِ اوقات کی خدا جانے کیا تلافی کرنی پڑتی معلوم نہیں کہ چھپکے چھپکے کیا راتب مقرر ہے کہ آج شاگردوں کے رجسٹر میں صدہا فارغ التحصیل مولویوں کا نام درج ہے اور روز دس پندرہ ذی استعداد شاگرد غزل لے کر آتے ہیں اور خطوط تو صدہا۔ قصائد پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان صنائع کا ایسا قادرانہ استعمال کون کر سکتا ہے۔ اور یہ بات تو جدی ہے کہ صاحب الہام نثا

آسان ہے اور یا استعداد ماننا دشوار تو برخوردار اب صاحبِ الہام کی مخالفت میں ایمان نہ جاتا ہے۔ ذرا ہوشیار ہو کر لب ہلاؤ اور اس سے کس کو انکار ہے کہ فَضَّلْنَا بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ لیکن تم کو کیا یہ وہی مثل ہوئی کہ برادرِ نازاں بہ تم میں کچھ دم درد ہو تو بولو۔

گر خدا خواہد کہ پردہ کس درد　　میلش اندر طعنۂ پاکاں بُرد

حسد چہ مے بری اے سست نظم بر حافظ　　قبولِ خاطر و لطفِ سخن خدا داد است

اصل یہ ہے کہ معاملہ ادا بندی، روزمرہ کی سلاست، کلام کی صفائی مطالب کی آسانی، مضامین کی شوخی غزل کی جان ہیں لیکن اگر کمالِ سخن اور معراجِ شاعری بھی اسی کو سمجھے ہو تو یہ غلط ہے اتنی ہی بات سے کلام سدرۃ المنتہا پر نہیں جا سکتا اور اگر اسی دھوکے میں ہو تو اب صاف صاف سناتے ہیں اور آپ کے بھلے کو آپ کا دل جلاتے ہیں۔ آپ نے اگر معاملہ اچھا باندھا تو کمال کیا کیا۔ اے حضرت معاملہ تو ہر عیاش، ہر خانگی بازاچھا باندھے گا۔ خلافِ شرع پر آپ نیا وہ بے باک ہیں تو کیا ثواب کی بات ہے۔ جن سے سیکھے ہو وہ حضرات صوفیہ ہیں وہ جب حدِ شرع سے عروج کر جاتے ہیں اور شرع شریف جس تنے کا جسم ہے اس پر دخل پاتے ہیں اُس وقت شیخ وغیرہ کو بُرا اور عُلمائے ظواہر پر آوازے کستے ہیں تم نے وہ درجہ تو حاصل نہ کیا اور شیخ و زاہد کو بُرا کہہ کے مفت اپنی عاقبت بگاڑی۔ اخلاق کی آبرو ریزی کی نہ خدا کا لحاظ نہ پیمبر کا پاس مفت

آیۃ والشعراء یتبعھم الغاوٗن کا مصداق بنے۔ آئندہ نسلوں کے لئے غلاظت کا انبار لگا چلے۔ رہا صرف روزمرّہ تو وہ تو دِلّی لکھنؤ کے مہتر کا بھی اچھا ہوتا ہے۔ کیا کمال کیا۔ کلام میں صرف صفائی ہے تو یہ بھی کیا کرامات ہے۔ جتنا علم کا مطلع صاف اتنا ہی غزل کا مطلع صاف۔ ہاں اگر فطرت نے خاص مادہ عطا فرمایا ہے تو تمام قیود سے آزادی ہے اور منکر سے سند مانگو کہ حسّان نے کس کالج میں پڑھا تھا اور سحبان کو کس یونیورسٹی سے ڈپلومہ ملا تھا اور شاعری کو علم و فضل کے ساتھ لازم و ملزوم جانتا ہو تو سمجھو کہ یہ حاسد ہے۔ کبرت کلمۃً تخرج من افواھھم ان یقولون الاکذباط۔ البتہ عام شائقین کو قواعد کی ازحد ضرورت ہے۔ ممکن ہے کہ فیضِ سخن کی وجہ سے ایک اَن پڑھ کے مُنہ سے وہ کچھ نکلے کہ بڑے بڑے فاضل بھی نہ کہہ سکیں لیکن یہ محال ہے کہ رُوح القدس کلام کی خوبیاں بھی سمجھا جائیں۔ یہ تو وہی سمجھے گا جو بلاغت جانتا ہو۔ دوسرے فیضان اپنے اختیاری نہیں آیا تو جواہر ورنہ ٹھیکر۔ اور قواعد داں شاعر اپنے ارادے سے اپنے اشعار میں خوبیاں پیدا کر سکتا ہے۔ کلام میں صفائی بھی ہو، شوخی بھی ہو، روزمرّہ بھی اعلیٰ ہو، معاملہ بندی بھی ہو، نازک خیالی بھی ہو، پھر حُسنِ بلاغت بھی ہو، عروجِ فصاحت بھی ہو۔ اگر ضرورت ہو تو شوکتِ الفاظ بھی ہو، متانتِ معنی بھی ہو، تشبیہ استعارہ کا رنگ بھی ہو، مجاز و کنایہ کا روغن بھی ہو، صنعت

کی جگہ دقّت بھی ہو۔ نہ کہ قصیدہ بھی غزل کے چرخ پر چڑھایا جائے۔ اور غزل میں جمعراتی مناجات یا مخمّس کا رنگ پایا جائے یہ بھی کوئی بات ہے کہ ایک ہی رنگ کے اُستاد ہیں اور وہ بھی گوبری لپتہ جب تمام لوازمات ہوں۔ تو بے اعتدالیاں بھی معاف کردی جاتی ہیں۔ اور اگر استادوں کی سند لاتے ہو تو یوں سنو۔ اوّل خوبیاں ویسی پیدا کرو پھر اس بارہ میں بھی ان کی برابری کرنا ورنہ کہاں دریا میں پیشاب کا قطرہ کہاں ایک گلاس بھر پانی میں ویسے ہو جاؤ تو سب معاف ہے۔ ورنہ بے سروں سے تو جہان بھرا ہوا ہے۔ ایک حمام میں سب ننگے اور میں بھی انہیں میں ہوں مگر کسی کو اپنی برہنگی نظر آتی ہے اور کسی کو نہیں کوئی نادم ہے کوئی نازاں کوئی متردد ہے کوئی بے فکر۔

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا

شعر میں ہر خوبی جوش۔ سوز۔ گداز۔ معاملہ۔ ادا۔ نازک خیالی۔ زبان۔ مضمون۔ رعایت۔ آورد شستگی۔ صفائی۔ سلاست۔ اخلاق مناسب اور باموقع ہو۔ تہذیب کی حد متانت کی رعایات۔ الفاظ کی شوکت معنی کی جدّت۔ فکر کی بلندی۔ طرز کی تازگی۔ بیان کی شوخی کا خوب صورت اندازہ اور موازنہ رہے، نہ کہ۔

کھلم کھلا فحش۔ ظاہر ظہور بے ڈھب بازاری محاورات۔ رکیک الفاظ۔

پامال مضمون۔ مبتذل تشبیہاں۔ سست بندش۔ نادرست ترکیب ثقل کلمات۔ بھدا اور بھونڈا کلام۔ بستہ استعاری۔ لغات کی ردی۔ متروکات کے انبار۔ غزل میں قصیدہ کا رنگ۔ قصیدہ میں غزل کی ترنگ آدھا تیتر آدھا بٹیر۔ سلونا نہ میٹھا حلوے اور حلیم کا مجموعہ۔ خاصے کتے کی تے۔ صاحبو خدارا ذرا غور کرو نہ علم کم نہ اہل علم کم۔ پھر مجبوری کیا ہے اور کون سا امر مانع ہے۔ کامل واقفیت تو ادنیٰ توجہ سے نہیں ہو سکتی۔ مگر ضروری واقفیت تو اس ادنیٰ سے رسالہ سے بھی ممکن ہے میں نہایت آسان طریقہ سے عرض کرتا جاتا ہوں۔ اب بھی سماعت نہ فرمائیں تو میرا کیا قصور ہے۔

علم معانی کی بحث میں دانستہ ترک کرتا ہوں اور صرف اتنا عرض کرنا مناسب جانتا ہوں کہ علم معانی میں یہ بتایا جاتا ہے کہ جملہ کب پورا بولتے ہیں۔ کب کوئی جزو محذوف ہو جاتا ہے۔ اور کس فائدہ کے لئے حذف کرتے ہیں قسم کا کون سا موقع ہوتا ہے اور لفظ کو مکرر کب بولتے ہیں اور کس غرض سے غرض جملہ کی ترتیب اور کمی بیشی وغیرہ وغیرہ کی کیفیت بیان کی جاتی ہے اور یہ تعریف ہے

علم معانی کی تعریف

علم معانی وہ علم ہے جس کے ذریعہ سے با موقع کلام کرنے میں خطا واقع نہ ہو۔

علمِ بیان کی تعریف

علمِ بیان اُن قاعدوں کا نام ہے جن کے ذریعہ سے ایک مطلب کو کئی طرح سے ادا کر سکیں۔ اس طریقہ سے کہ ایک جملہ سے وہ مطلب جلد سمجھ میں آجائے اور دوسرے سے ذرا غور کے بعد۔ مثلاً دراز قامت آدمی سے جب کوئی خطا ہو تو کہیں آپ کے قد کی خوبی ہے اگرچہ اس جملہ کے معنی یہ ہوئے کہ تم احمق ہو۔ مگر ذرا غور طلب ہے۔ اس سے زیادہ غور طلب یوں ہو سکتا ہے کہ اُسی موقع پر یوں کہیں کہ آپ کے قد کی تعریف تو حدیث شریف میں آئی ہے اس طرح گویا کل طویل احمق کی طرف توجہ دلاتا ہے اور اس صورت میں وہی پہلا مطلب اور زیادہ دیر میں سمجھ میں آتا ہے۔ پس ان طریقوں کے سمجھ لینے سے رمز، کنایہ، حقیقت مجاز کی وجہ سے کلام میں لطف پیدا ہو جاتا ہے۔ اور استادوں کی سند کی ضرورت بہت کم ہوتی ہے ورنہ بے سند سابقہ قدم نہیں اٹھا سکتے اور اس روش کے پابند نہ نیا استعارہ تراش سکتے نہ جدید تشبیہ نکال سکتے۔ نہ تازہ کنایہ ایجاد کر سکتے نہ کوئی اور صفت لگا سکتے بلکہ ہر قاعدہ کو محاورہ کہتے ہیں اور اگر ایک نے مژگان کو خنجر لکھا تو نہ اس کو قاعدہ کی خبر نہ دریافت کرنے والے کو واقفیت بلکہ ایک مجتہد الشعراء دوسرے

ملک الشعراء سے یوں فرماتے ہیں۔ حضرت خنجر کو مژگاں لکھنے کا محاورہ نہیں ہے۔ (واہ کیا محاورہ اور کیا محاورہ دانی ہے) دوسرے صاحب جواب میں فرماتے ہیں جی ہاں خرگاں کو خنجر لکھنے کا محاورہ ہے۔ فلاں نے کہا ہے۔ واہ کیا سند ہے۔ اور کیا سمجھ ہے۔ اب تو معصوم کا حوالہ دے دیا اب کیا رہا دونوں چوپی شاعر خوش ہو گئے۔ پالا پڑ جائے کسی آزاد سے تو دو لگائے (چپت) اور غزل چھین کر مشاعرے سے باہر کر دے۔

سپید پوش بن گئے جو شہر کے چمار تھا ۔۔۔ کوئی لنگوٹی ٹاٹ میں جا کے تین چلا تھا

یہ بچارے بوسیدہ خیالات اور لبستہ مضامین کے جیل خانہ میں حبس دوام بھگتتے بھگتتے مر جاتے ہیں آدمی تصویر نہ بنا سکے تو پرانی تصویروں میں رنگ بھرنا تو سیکھ لے۔ (خیر اصل مطلب سنئے)

علم بیان میں حقیقی معنی سے تو بحث نہیں مجازی معنی سے بحث ہوتی ہے اور مجازی معنی لینے کے تین قاعدے ہیں۔ استعارہ۔ کنایہ۔ مجازہ اور استعارہ سمجھانے کے لئے تشبیہ کا بیان اور شریک کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح علم بیان چار چیزوں میں محصور ہے۔ یہاں سے ترتیب وار بیان کیا جاتا ہے۔

تشبیہ کا بیان

ایک صفت میں دو چیزوں کی شرکت ظاہر کرنے کو تشبیہ کہتے ہیں۔

(ارکان تشبیہ) تشبیہ میں پانچ چیزیں ہوتی ہیں۔

(مشبّہ) ایک وہ شے جس کو مشابہ کرتے ہیں۔

(مشبّہ بہ) دوسرے وہ شے جس کے ساتھ تشبیہ دیں۔

(وجہ شبہ) تیسرے وہ صفت جس میں مشابہ کریں۔

(حرف تشبیہ) چوتھے وہ لفظ جس کے ذریعہ سے مشابہ کریں۔

(غرض تشبیہ) پانچویں تشبیہ دینے کی غرض ہجو یا تعریف وغیرہ قد، راستی میں مثل، سرو ہے۔ مشبّہ۔ وجہ شبہ۔ حرفِ تشبیہ۔ مشبہ بہ غرض تشبیہ قرینہ سے ظاہر ہے کہ تعریف ہے۔ غرض تشبیہ تو ہمیشہ طریق بیان ہی سے معلوم ہوتی ہے اور بقیہ چار چیزوں میں سے کبھی تین بیان کی جاتی ہیں جیسے (۱) قد مشبہ۔ راستی میں۔ وجہ شبہ۔ سرو ہے مشبہ بہ۔

اس میں حرف تشبیہ مثل یا مانند اُڑا دیا یا جیسے

(۲) قد مشبہ۔ مثل حرف تشبیہ۔ سرو ہے مشبہ بہ۔

کبھی ایک چیز اور کبھی کم کر دیتے ہیں۔ جیسے قد۔ سرو ہے۔ قد مشبہ سرو مشبہ بہ۔ پہلی مثال میں وجہ شبہ بیان نہیں کی۔ دوسری مثال میں حرف تشبیہ اور وجہ شبہ دونوں ندارد لیکن اب کمی کی گنجائش نہیں ورنہ استعارہ ہو جائے گا۔ اور تشبیہ استعارہ میں یہی فرق ہے کہ اگر مشبہ مشبہ بہ دونوں ہوں تو تشبیہ ہے اور دونوں میں سے ایک بیان کیا جائے تو اس کو

استعارہ کہتے ہیں اور مفصل بیان اس کا استعارہ میں آئے گا۔

عقلی اور حسّی

جو شے ظاہری پانچ حواس یعنی آنکھ، ناک، کان، زبان اور چھونے سے معلوم ہو وہ حسّی ہے۔ اور جو ان پانچوں حواس سے معلوم نہ ہو اور صرف عقل سے معلوم ہو جیسے موت، زندگی۔ وہ عقلی ہے مشبہ مشبہ بہ کبھی دونوں حسّی ہوتے ہیں۔ کبھی دونوں عقلی۔ کبھی ایک ایسا ایک ویسا۔ تمثیلیں ملاحظہ ہوں۔

تمثیلات

قد سرو کی مانند ہے مشبہ مشبہ بہ دونوں حسّی۔ قد۔ قیامت کے مانند ہے مشبہ حسّی، مشبہ بہ عقلی قیامت قد کے مانند ہے مشبہ عقلی مشبہ بہ حسّی علم زندگی کی مانند ہے۔ مشبہ مشبہ بہ دونوں عقلی۔ عقلی چیز کو حسّی سے اس لئے تشبیہ دیتے ہیں کہ بخوبی ذہن نشین ہو اور حسّی کو عقلی سے اس لئے کہ اس کی ندرت اور عظمت ظاہر ہو۔

مشبہ مشبہ بہ کبھی مفرد ہوتے ہیں جیسا کہ اوپر بیان ہوا کبھی مرکب جیسے مرزا غالب مرحوم مغفور فرماتے ہیں۔

بنتے ہیں سونے روپے کے چھلے حضور میں ۔ ہے جن کے آگے سیم و زر مہر و ماہ ماند
یوں سمجھیے کہ بیچ سے خالی کیے ہوئے ۔ لاکھوں ہی آفتاب ہیں اور بے شمار چاند

اِس شعر میں چھلا مشبہ مفرد ہے اور چاند یا سورج جب کہ خالی کر لئے گئے ہیں مشبہ بہ مرکب ہیں۔ اِسی طرح مشبہ مرکب اور مشبہ بہ مفرد بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح کبھی دونوں مرکب بھی ہوتے ہیں کبھی ایک ہیئت مجموعی کو دوسری ہیئت مجموعی سے تشبیہ دیتے ہیں۔ میرزا سودا مرحوم فرماتے ہیں۔

زلفیں بکھری ہوئی یوں چہرہ پہ کھاتی ہیں بل ÷ جس طرح ایک کھلونے پہ لٹیں دو بالک

کبھی چند مشبہ بیان کرتے ہیں۔ پھر ترتیب وار مشبہ بہ بیان کرتے ہیں۔ حضرت ظفر خلد آشیاں فرماتے ہیں:۔

بنا دیں ہم تمہارے کاکل و عارض کو کیا سمجھے ÷ اسے ہم سانپ سمجھے اور اسے من سانپ کا سمجھے

اس میں کاکل و عارض دو مشبہ اور سانپ اور سانپ کا من دو مشبہ بہ ہیں۔ اسی طرح کئی کئی مشبہ اور مشبہ بہ بھی لاتے ہیں۔ کبھی ایک مشبہ ایک مشبہ بہ ترتیب وار لاتے ہیں۔

چشم ہے قہر بلا زلف قیامت قامت ÷ اس لئے لوگ تمہیں آفتِ جاں کہتے ہیں

کبھی ایک مشبہ کے چند مشبہ بہ ہوتے ہیں۔ جیسے مولانا جامی علیہ الرحمتہ فرماتے ہیں:۔

عارض است این یا قمر یا لالہ حمرا ست این ÷ یا شعاع شمس یا آئینہ دلہا ست این

کبھی دو متضاد چیزوں کو بطور طنز اور ظرافت کے تشبیہ دیتے ہیں۔ جیسے بخیل کو حاتم ہے، نامرد کو رستم ہے۔ اگر وجہ شبہ ظاہر کردی جائے تو ایسی تشبیہ کو تشبیہ مفصل کہتے ہیں جیسے کہیں قد راستی میں سرو ہے۔ چونکہ راستی یہاں مذکور ہے اور یہی وجہ شبہ ہے اس لئے یہ تشبیہ مفصل ہے ورنہ مجمل کہلاتی۔ اگر مشبہ مشبہ بہ میں شرط لگا دیں تو وہ تشبیہ مشروط کہلاتی ہے۔ جیسے۔ "رخ ترا گل تھا اگر گل میں یہ خوبی ہوتی" اگر تشبیہ دے کر اس سے ترقی کریں تو اس کو تشبیہ تفصیل کہتے ہیں۔ جیسے۔

سرو ہے تو مگر غلط کہ کہاں　　　سرو گلشن میں طاقتِ رفتار

غرض تشبیہ کبھی تعریف کبھی توہین کبھی فقط حالت اظہار ہوتی ہے کبھی ناممکن امر کا ممکن ثابت کرنا مقصود ہوتا ہے جس تشبیہ میں حرف تشبیہ ہوتا ہے اُس کو مرسل اور جس میں حرفِ تشبیہ نہ ہو اس کو مؤکد کہتے ہیں تشبیہ مؤکد قوی اور بلیغ ہوتی ہے بہ نسبت مرسل کے یہ تشبیہ کا حال نامکمل سا بیان کیا گیا مفصل حال حدائق البلاغت میں ملاحظہ فرمائیے۔

استعارہ کا بیان

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ علم بیان میں غیر حقیقی معنی سے بحث کی جاتی ہے

کیونکہ حقیقی معنی کے لئے لغت ہی کافی ہے اور غیر حقیقی معنی لینے کے صرف تین طریقے ہیں۔

اوّل استعارہ۔ گدھا اور اُلّو۔ ان الفاظ کے ایک تو اصلی معنی ہیں۔ دوسرے بیوقوف کے معنی میں بولتے ہیں۔ ان الفاظ کے پہلے معنی بمعنی ایک جانور کے حقیقی معنی ہیں جو کسی نے لغت بناتے وقت مقرر کئے تھے۔ علمِ بیان میں اس سے تو سروکار نہیں۔ رہے دوسرے معنی بیوقوف کے۔ اس میں دیکھنا چاہئے کہ یہ معنی کس مناسبت سے مقرر ہوئے ظاہر ہے کہ یہ معنی مشابہت کے سبب سے لئے گئے ہیں پس جب کبھی مشابہت کے باعث دوسرے معنی لئے جائیں اس کو استعارہ کہتے ہیں۔ اگر ہم کہیں کہ آج شب کو آفتاب ہم سے ہم بزم رہا اور سوال ہو کہ آفتاب ہم بزم نہیں ہو سکتا اور وہ بھی شب کو تو ہم جواب دیں گے کہ بوجہ مشابہت کے آفتاب کے معنی یہاں معشوق لئے ہیں اور یہ شبہ کہ شاعر کے دل کا حال کیونکر سمجھا جائے تو کہا جائے گا کہ آفتاب استعارہ ہے بمعنی معشوق کے اور ہم بزم ہونا اور خصوصاً شب کو یہ اشارہ اور قرینہ ہے اس بات کا کہ آفتاب سے آفتاب مراد نہیں ہے بلکہ ایسی شے مراد ہے جس میں بالارادہ شب کو نکلنے آنے جانے اور ہم بزم ہونے کی قابلیت ہے۔ پس جب لفظ کے معنی حقیقی معنی کے علاوہ مشابہت

کے باعث لے سکتے ہوں گے ضرور اور بے تردّد لیں گے اور ایک لفظ کے مختلف معنی اور اس کا مختلف استعمال کر سکیں گے۔ مثلاً پہاڑ۔ جب ہم استعارہ کے قاعدے سے واقف ہوں گے تو اس لفظ پہاڑ کے بہت سے معنی لیں گے۔

قدرت ووُسعت

جتنی چیزوں کو پہاڑ سے تشبیہ دے سکتے ہیں ان سب کے معنی میں پہاڑ بول سکیں گے۔ قلعہ، گھوڑا، پہلوان، ہاتھی، مکان گرز ان سب چیزوں کو پہاڑ سے تشبیہ دیتے ہیں۔ تو جب استعارہ کرنا ہوگا تو ہم پہاڑ کو بمعنی قلعہ، بمعنی گرز، بمعنی اسپ وغیرہ بہت سے معنی میں لے سکتے ہیں۔ قدرت یہ پیدا ہوئی کہ اگر دو ہزار الفاظ ہم کو یاد تھے تو وہ الفاظ اب دس ہزار کا کام دیں گے اور ایک ایک لفظ کے کئی کئی معنی بے منت لغت لئے جا سکیں گے اور قوت یہ پیدا ہوئی کہ اس بچّے کی طرح نہ رہے جو سہارے بغیر قدم نہیں اٹھا سکتا بلکہ اس جوان کی طرح ہو گئے جو دوڑ میں ہمیشہ اوروں سے آگے نکل جانے کا حوصلہ رکھتا ہے۔

ہر امر میں اساتذہ کی سند کی احتیاج نہ رہی قاعدہ کے موافق دیکھ لیا

اور مطمئن ہوئے ورنہ عجیب مصیبت میں جان رہتی۔ ریل کو ہوا سے
تشبیہ دینا جب ہی جائز ہو کہ کسی اور نے بھی لکھا ہو ورنہ کلام ہی غلط۔
پس بات یہ ہونی چاہئے کہ ہمیشہ نیا استعارہ پیدا کرنے کی کوشش ہو
اور ہم وہ لکھنا پسند کریں جو ہم سے پہلوں نے نہ لکھا ہو قاعدہ کے
مطابق دیکھ لیا اور بے فکر ہوئے، نہ یہ کہ ہم ابتدا ہی سے سوچ لیں
کہ جو کچھ اوروں سے سنیں گے اس کے سوا کچھ نہ لکھیں گے تو
جدت کیونکر ہوگی بلکہ محاورات اور بندش اساتذہ کے معاملات
گزشتہ اور دیدہ یا مجبوراً فرضی کے موافق ہوں اور تشبیہ استعارہ میں
ہمیشہ جدت کی فکر ہونی چاہئے ورنہ کمزوری ہے۔ اور تشبیہ میں وہ
خوف بھی نہ رہا کہ اساتذہ نے برتا ہے یا نہیں۔ اب تو یہ قدرت ہوگئی
کہ جن چیزوں میں ایک یا چند صفتیں شریک پائیں گے بے تکلف
تشبیہ دیں گے اور سند کی بجائے ہم ارکان تشبیہ دیکھ لیا کریں گے
جہاں یہ موجود ہوں تشبیہ درست ہے ورنہ غلط۔ مثلاً ایک شخص
نے کتاب کو ٹٹو سے تشبیہ دی تو غلط ہے اس لئے کہ مشبہ کتاب
اور مشبہ بہ ٹٹو اور وجہ شبہ ندارد۔ تشبیہ غلط ہے اور اس میں
بھی اگر وجہ شبہ کسی مناسبت سے پیدا ہو جائے تو تشبیہ درست
ہو جائے گی۔ لیکن اسی کتاب کو حضرت خضر سے تشبیہ دی تو درست ہے

کیونکہ کتاب مشبہ خضر مشبہ بہ۔ رہنمائی اور ہدایت وجہ شبہ تعریف
غرض تشبیہ۔ اور حرف تشبیہ ظاہر ہوگا یا پوشیدہ پس تشبیہ درست ہے
اس سے بحث نہیں کہ پہلے کسی نے کتاب کو خضر سے تشبیہ دی ہے یا
نہیں بلکہ اگر کسی نے پہلے بھی تشبیہ دی ہے تو ہماری خوبی اور صناعی
کیا ہوئی اور تشبیہ میں یہ اعتراض نہیں ہوسکتا کہ فلاں صفت مشبہ بہ
میں تو ہے مگر مشبہ میں نہیں اس لئے تشبیہ غلط ہے۔ مثلاً کتاب کے
ڈاڑھی نہیں اور حضرت خضر کے ڈاڑھی مونچھ اور جان ہے لہذا تشبیہ
غلط ہے یہ شبہ درست نہیں بلکہ فرض ہے کہ مشبہ اور مشبہ بہ ایک یا
چند صفتوں میں شریک ہوں، ایک یا چند امور میں مختلف اور مخالف ورنہ
تشبیہ غلط ہو جائے گی۔ ہم کو تو صرف ارکان دیکھ لینے ہیں ورنہ اس قسم
کے اعتراض تو ہر تشبیہ پر ہوسکتے ہیں۔ آپ نے قد کو سرو کہا معترض نے
کہا قد میں جڑیں کہاں ہیں اور سرو کے دو پاؤں نہیں تشبیہ تو غلط ہے۔ آپ
نے ابرو کو خنجر سے تشبیہ دی اعتراض وارد ہوا کہ ابرو میں قبضہ اور میان
نہیں اور خنجر پر بال نہیں بس تو فیصلہ ہوا تشبیہ کا دفتر ہی گاؤ خورد ہوا
بلکہ ابرو مشبہ۔ خنجر مشبہ بہ۔ خم اور عاشق کے دل پر تلوار کا اثر کرنا وجہ
شبہ ہے اب خواہ ہزار چیزوں میں یہ اور وہ مخالف ہوں مضائقہ نہیں
اعلیٰ حضرت قدر قدرت بندگانِ عالی متعالی کی مرحمت فرمائی ہوئی طرح میں

مشاعرہ ہوا۔ شعراء نے خوب خوب دادِ فصاحت دی۔ عاصی بھی حاضر تھا جو کچھ ہو سکا بکا۔ اس میں ایک نئی تشبیہ باندھ دی۔ نئی کے یہ معنی کہ میں نے اب تک نہ دیکھی نہ سنی۔ میرے علم سے باہر کسی نے لکھی ہو تو خبر نہیں یعنی عاشق کی مژہ کو خنجر باندھ دیا اس کی پرواہ نہ کی کہ آیا باندھی گئی ہے یا نہیں میں نے قاعدہ کی کسوٹی پر لگایا کس درست نکلا۔ اپنے سونے کو کھرا جانا۔ وہ غزل یہ ہے:۔

غزل

لب پہ میرے آب آب دیکھئے کبتک رہے
سارا سمندر سراب دیکھئے کبتک رہے

لاکھ میں وہ انتخاب دیکھئے کبتک رہے
آپ ہی اپنا جواب دیکھئے کبتک رہے

ہجر سے عاشق بزار وصل سے دلبر کو عار
الحذر الاجتناب دیکھئے کبتک رہے

نشہ و جوش شباب وصل میں آئی نقاب
لیکن اب اس کا حجاب دیکھئے کبتک رہے

شعلہ حسن بتاں پھونک چکا ہے جہاں
خیر سے تو اے نقاب دیکھئے کبتک رہے

دیکھ کے گریہ مرا چاک ہے دل خلق کا
خنجر مژگاں پُر آب دیکھئے کبتک رہے

تشنۂ دیدار کو بوند بھی ملتی نہیں
حُسن کا دریا سراب دیکھئے کبتک رہے

ہائے فراق دوام موت کا قائم مقام
حشر کا نائب مناب دیکھئے کبتک رہے

پہلو و سر میں کبھی قلب و جگر میں کبھی
درد کو یہ انقلاب دیکھئے کبتک رہے

دستِ نگاریں میں جام اُس میں مئے لالہ فام — شاخِ سمیں میں گلاب دیکھئے کب تک رہے

تم نہیں آتے تو اب بھاگتے ہیں مجھ سے سب — موت کو بھی اجتناب دیکھئے کب تک رہے

کاٹ کے میرا گلو روتا ہے خنجر لہو — دیدۂ جوہر پُر آب دیکھئے کب تک رہے

شرم وہاں مُہرِ لب سدِّ سخن یہاں ادب — دونوں طرف یہ حجاب دیکھئے کب تک رہے

رُخ اُدھر آئینہ تاب آئینہ رُخ کا جواب — بحثِ مہ و آفتاب دیکھئے کب تک رہے

آج سخا بار بار دیکھتے ہیں روئے یار
دورۂ اُم الکتاب دیکھئے کب تک رہے

جب کہ مژگان پُر آب بھی ہے اور گریہ سے جو خاص کرکے مژگاں کا آب ہے خنجر اور مژگاں میں عمدہ وجہ شبہ پیدا ہو گئی تشبیہ دے دی۔ اس کے علاوہ غزل کی اور تشبیہات۔ بندش۔ قوافی کے جدید پہلو چستی بمع برجستگی الفاظ آپ کی سخن وری کے انصاف کے حوالہ ہیں اب پھر اصل مطلب سُنیئے۔

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ تشبیہ کے دونوں ضروری ارکان میں سے اگر ایک کو حذف کر دیں تو استعارہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً۔

ربط نہ ہونے لگا اُس شمع کو پروانوں سے — آشنائی کا کیا حوصلہ بیگانوں سے

ظاہر ہے کہ شمع سے مُراد معشوق اور پروانہ سے مُراد عاشق ہے اور اصل میں عبارت یہ ہے کہ اُس معشوق کو جو شمع کے مانند ہے

عاشقوں سے جو پروانوں کے مانند ہیں ربط رہنے لگا۔ اس مصرع میں دو تشبیہاں تھیں شمع کی مانند معشوق اور پروانہ کی مانند عاشق۔ ان میں معشوق اور عاشق مشبہ اور شمع و پروانہ دو مشبہ بہ۔ دونوں مشبہ محذوف ہوئے اور دونوں مشبہ بہ ان کے عوض رکھ دیے۔ یہ وہ صورت ہے کہ تشبیہ کا شبہ اڑا دیا اور استعارہ بنا لیا۔ ایسے استعارہ کو استعارہ بالتصریح کہتے ہیں۔

اب دوسرا طریقہ رہا وہ یہ کہ تشبیہ سے استعارہ یوں بنائیں کہ مشبہ بہ اڑا دیں اور استعارہ بن جائے۔ لیکن جب مشبہ اڑا کر مشبہ بہ اس کی جگہ برتا تھا تو صرف اسی قدر دقت پیدا ہوئی تھی کہ شمع تو ہے لیکن اس سے کون سی چیز موجودات میں سے مقصود اور مراد ہے وہ قرینہ سے ظاہر تھا۔ اب اس سے کچھ زیادہ دقت ہوگی۔ کیونکہ ہم آدمی کو اول شیر سے تشبیہ دیں گے۔ پھر یہ تشبیہ کا مضمون تو ظاہر نہ کریں گے بلکہ صرف آدمی یا زید یا جو کچھ مشبہ ہوگا اُسے بیان کریں گے ۔ اور سامع سے اس امر کے امیدوار رہیں گے کہ سامع بھی آدمی یا زید سے وہی مُراد لے۔ اور مشبہ بہ محذوف جو ہمارے ذہن میں ہے سمجھ جائے۔ اس کی یہ ترکیب ہے کہ پہلے اپنے ذہن میں ایک چیز کو دوسری چیز سے تشبیہ دی پھر مشبہ کو ظاہر کیا اور مشبہ بہ کو

ذکر نہ کیا۔ مگر اس مدعا کے ظاہر کرنے کے لئے محذوف مشبہ بہ کے خواص میں سے کوئی خاصیت مشبہ میں لگا دی۔ اس اشارے سے یہ معلوم ہو جائے گا کہ مشبہ کو عین مشبہ بہ فرض کر لیا ہے۔ مثلاً۔ زید میدان میں دہاڑا تو جگر پھٹنے لگا۔ اس میں اوّل تو زید کو شیر سے تشبیہ دی پھر مشبہ بہ کو محذوف کیا تو استعارہ ہوا اور اس خیال اور عمل کے اظہار کے لئے شیر کا ایک خاصّہ دہاڑنا زید کے ساتھ لگا دیا۔ جس سے صاف صاف معلوم ہوتا ہے کہ زید سے مُراد شیر ہے یعنی زید کو انسان کی جگہ شیر فرض کیا ہے۔ اس قسم کے استعارہ کو استعارہ بالکنایہ کہتے ہیں۔ اس طرح دو قسم کا استعارہ ہوا۔ ایک یہ کہ مشبہ کی جگہ مشبہ بہ کا استعمال کریں۔ یہ استعارہ بالتصریح ہے دوسرے یہ کہ مشبہ کو بیان کریں اور مشبہ بہ مُراد لیں یہ استعارہ بالکنایہ ہے اب پھر ایک ہی مثال میں دیکھئے:۔ زید میدان میں دہاڑا تو جگر پھٹنے لگا۔ یہ تو وہ صورت ہے کہ زید مشبہ کو بیان کیا ہے اور شیر مشبہ بہ کو محذوف کر کے دہاڑنا جو خاص شیر کا خاصّہ ہے مشبہ کے ساتھ لگا دیا جس سے شاعر کا منشا معلوم ہو گیا۔

اسی مثال میں اگر ذرا تغیر کر دیں تو یوں کہہ کر استعارہ کی دوسری صورت ہو جاتی ہے مثلاً:۔ شیر کے حملوں سے اعدا کا جگر پھٹنے لگا۔ آدمی جو

شیر کے مانند تھا اُس نے ایسے حملے کیے کہ دشمن ڈرنے لگے یا حملوں کی جگہ نعروں سے کہیے اور نعروں سے مُراد رجز یا ڈانٹنا کہیے۔

خلاصہ

استعارہ تشبیہ سے بنتا ہے۔ اگر مشبہ کو حذف کریں تو استعارہ بالتصریح ہے۔ اگر مشبہ بہ کو حذف کر کے مشبہ کے ساتھ اس کی کوئی خاصیت لگا دیں تو استعارہ بالکنایہ ہے۔

افعال و مصادر میں بھی استعارہ ہوتا ہے جیسے اُڑانا۔ دوڑانے کے معنی میں گھوڑا۔ اُڑانا جدا کرنے کے معنی میں۔ سر اُڑانا۔ بلند کرنا۔ جیسے کنکوا اُڑانا۔ کرنا کے معنی میں۔ مزہ اُٹھانا۔ پینا کے معنی میں شراب اُڑانا۔ ان سب معنوں میں اُڑانا استعارہ ہے ورنہ اُڑانا اصل میں پردار چیزوں سے متعلق ہے۔ ایک اور لحاظ سے استعارہ چار قسم کا ہوتا ہے مطلقہ۔ مجردہ۔ مرشحہ۔ موشحہ۔ اگر مشبہ اور مشبہ بہ (مستعارلہٗ و مستعارمنہ) دونوں کے مناسبات بیان نہ ہوں تو اس کو استعارہ مطلقہ کہتے ہیں۔ اور اگر صرف مشبہ کے مناسبات بیان کریں تو استعارہ مجردہ ہے۔ اگر مشبہ بہ کے مناسبات بیان کریں تو استعارہ مرشحہ ہے۔ تمثیلات:۔

اچھا جو خفا ہوتے ہو تم اے صنم اچھا

اس میں صنم استعارہ ہے بمعنی معشوق اور کوئی مناسبت یا ملازمہ کا لفظ نہیں ہے اس لئے یہ استعارہ مطلقہ ہے۔ فردوسیؒ فرماتے ہیں :۔

بخائن زرہ بافت از مشک ناب　　　　در آویخت از گوشۂ آفتاب

ناخن سے خالص مشک کی زرہ بُن کر آفتاب کے کنارہ پر لٹکادی اس تمثیل میں زرہ زلف کے معنی میں استعارہ ہے۔ اور ناخن، بُننا، مشک، زلف مشبہ (مستعارلہ) کے مناسبات ہیں اس لئے یہ استعارہ مجردہ ہے۔ اور اگر مشبہ بہ مستعار منہ کے مناسبات بیان کریں تو یہ استعارہ مرشحہ ہے۔ جیسے :۔

حاجت کی کماں سے جب ہوئی دیر　　　　گھبرا کے پلنگ سے اُٹھا شیر

شیر سے مرد شجاع مُراد ہے اور پلنگ مشبہ بہ (مستعارمنہ) کے مناسب ہے بطریق ایہام کے۔ اور اگر دونوں کے مناسبات بیان ہوں تو اس کو استعارہ موشحہ کہتے ہیں۔ جیسے خاقانیؒ فرماتے ہیں :۔

بر شگافد صبا مشیمہ صبح　　　　طفل خونیں بجا ورا ندازہ

جس ترتیب سے نام لکھے گئے اس ترتیب سے ایک سے دوسرا بلیغ اور عمدہ ہوتا ہے۔

صبا صبح کا مشیمہ چاک کر کے آفتاب کو مشرق میں ڈال دے۔
آفتاب مشبہ (مستعارلہ) طفل خونیں مشبہ بہ (مستعارمنہ) ہے آفتاب کو حذف کیا اور طفل خونیں سے آفتاب مُراد لیا تو استعارہ ہوا۔ اور صبا شب خاور مشبہ کے مناسبات اور مشیمہ خونیں۔ تشگافتن مشبہ بہ کے مناسبات ہیں۔ مشیمہ اُس غلاف کو کہتے ہیں جس میں لپٹا ہوا بچہ پیدا ہوتا ہے۔

اصطلاحات

استعارہ کے بیان میں مشبہ کو مستعارلہٗ مشبہ بہ کو مستعارمنہ۔ اور وجہ شبہ کو وجہ جامع کہتے ہیں۔

مجازِ مرسل کا بیان

ایک لفظ کے معنی جب اصل لغت کے خلاف لیں۔ لیکن وہ معنی تشبیہ کے علاقہ سے لئے جائیں تو اُس کو استعارہ کہتے ہیں۔ اور اگر کسی اور تعلق سے دوسرے معنی لئے جائیں تو اُس کو مجازِ مرسل کہتے ہیں۔ جیسے روزمرّہ بولتے ہوں گے۔ ایک گلاس دینا اور مُراد یہ ہوتی ہوگی کہ پانی لانا۔ اِلّا کسی خاص موقع پر کہ گلاس ہی فقط مطلوب ہو۔

حالانکہ پانی اور گلاس میں نہ تو تشبیہ کا علاقہ ہے اور نہ دونوں بالکل بے تعلق ہیں بلکہ آپس میں ظرفیت اور مظروفیت کا علاقہ ہے یا انگلی کٹ جانے پر کہیں ہاتھ کٹ گیا۔ کیونکہ ہاتھ اور انگلی میں جزو اور کُل کا علاقہ ہے۔

اِسی طرح بہت سے تعلقات ہیں کہ اُن کے سبب سے لفظ کے دوسرے معنی لئے جاتے ہیں چند طریقے بیان کئے جاتے ہیں ملاحظہ ہوں۔

(۱) مسبّب کو بجائے سبب کے بولتے ہیں۔ جیسے زمانہ کا رطب و یابس اور اس سے مراد زمانہ کے تغیرات ہوں یا پست و بلند یا فراز و نشیب ظاہر ہے کہ زمانہ کے تغیرات ان چیزوں کا باعث ہوتے ہیں اور یہ امور سب ان تغیرات کے نتیجے ہیں گویا باعث کی جگہ اس کے نتیجہ کو بولے۔

(۲) کبھی اس کا برعکس یعنی سب کو بجائے مسبّب کے بولتے ہیں۔ جیسے آگ جل رہی ہے۔ حالانکہ لکڑی جل رہی ہے اور آگ اس کا سبب ہے

(۳) ظرف کو بجائے مظروف کے لاتے ہیں۔ جیسے قارورہ بمعنی پیشاب۔ حالانکہ قارورہ کے معنی شیشہ کے ہیں اور وہ پیشاب کا ظرف ہے اور پیشاب مظروف۔ یا جیسے مکیں مراد لیں اور مکان بولیں۔ آج سارا گھر نہیں سویا۔ حالانکہ گھر والے نہیں سوئے۔ گھر میں سونے جاگنے کی لیاقت کہاں۔ یا نہر کا جاری ہونا۔ حالانکہ پانی جاری ہوتا ہے نہ کہ نہر۔

(۴) کبھی اس کا عکس یعنی بولیں مظروف، مراد لیں ظرف۔ جیسے گلاب طاق پر رکھ دو۔ حالانکہ بوتل مراد ہے۔

(۵) کبھی زمانہ گزشتہ کی حالت زمانہ حال پر بولی جاتی ہے۔ جیسے انسان قطرۂ آب ہے یا طبیب زادہ کو حکیم صاحب کہنا۔

(۶) کبھی اس کے خلاف چیز پر زمانہ مستقبل کے حالات کا اطلاق کرتے ہیں۔ جیسے انسان مُشتِ خاک ہے یا طالب علم کو مولوی صاحب کہنا۔

(۷) کبھی کُل بجائے جزو کے۔ جیسے کہیں انگرکھا کیچڑ میں بھر گیا حالانکہ اس کا کوئی جزو وغیرہ بھرا ہوگا۔

(۸) کبھی اس کے عکس جیسے بارود۔ حالانکہ بارود کے معنی صرف شورہ ہے۔ یا یاقوتی کہ اس میں بہت سی دوائیں شریک ہیں صرف یاقوت نہیں ہیں یا قدم دیکھنے کا شوق ہے حالانکہ تمام جسم مراد ہے۔

(۹) کبھی عام بجائے خاص کے۔ جیسے آج کالا مارا اور کالے سے مراد کالا سانپ ہو۔ نسیم

جب صبح ہوئی تو منہ میں ڈالا   کالے نے من اژدہے نے کالا

(۱۰) کبھی آلہ بمعنی شے بولا جاتا ہے جیسے بدزبان بمعنی بدکلام۔ آپ کا قدم مبارک ہو لفظ قدم بمعنی آنا۔

(۱۱) کبھی مادہ بول کر چیز مراد لیتے ہیں۔ آمنہ بیگم کے ہاتھوں میں سونا بہت ہے

حالانکہ سونا زیور کا مادہ ہے۔ اور مجاز کے بہت سے طریقے ہیں غور کیجئے گا تو روزمرہ میں خود معلوم ہوتا رہے گا۔ عاقلے را اشارہ کافی است۔

کنایہ کا بیان

تشبیہ میں ایک چیز کو دوسری چیز سے مثال دیتے ہیں۔ استعارہ میں تشبیہ کے تعلق سے دوسرے معنی لیتے ہیں اور اوّل معنی مقصود نہیں ہوتے۔ مجاز میں لفظ کے دوسرے معنی لیتے ہیں لیکن اصلی اور غیر اصلی معنی میں تعلق تشبیہ کا نہیں ہوتا اور کچھ تعلق ہوتا ہے اور پہلے معنی بالکل مراد نہیں ہوتے۔ کنایہ میں لفظ کے اصلی معنی بھی مقصود ہوتے ہیں اور اس سے جو نتیجہ نکلتا ہے وہ بھی مراد ہوتی ہے یعنی لازم اور ملزوم دونوں معنی مقصود ہوتے ہیں۔ جیسے کہیں کہ خدا کے گھر سے پھرے اور مراد ہو کہ مرتے مرتے بچے۔ یا تشنیہ بتنو آفتاب

کنایہ تین قسم کا ہوتا ہے۔ اوّل جس سے موصوف کی ذات مقصود ہوتی ہے جیسے سُونڈ والا جانور۔ دوّم جس سے صرف صفت مراد ہو۔ جیسے سر پر چڑھنا۔ بمعنی گستاخی۔ سوّم یہ کہ یہ کنایہ کے ذریعہ سے کسی موصوف کے لئے کسی صفت کا ثبوت یا نفی مقصود ہو ثابت کرنے کے لئے۔ پھر دو دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ ایک ہی صفت ایسی بیان کی جائے جو موصوف کی ذات سے مخصوص ہو جیسے سُونڈ والا۔ یہ ایسی صفت ہے کہ ہاتھی کے سوا اوروں میں نہیں پائی جاتی

یہ کنایہ قریب کہلاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ چند صفتیں جمع کریں اور اُس مجموعہ سے ایک ذات مخصوص ہو جائے۔ اور اگر ان صفتوں کو علٰحدہ علٰحدہ دیکھیں تو اوروں میں بھی پائی جائیں مثلاً چوڑے ناخن والا راست قامت جاندار۔ تنہا یہ صفتیں اوروں میں بھی پائی جاتی ہیں مگر ان سب کا مجموعہ فقط انسان ہے۔ اسی طرح نفی کی حالت میں ایما، رمز، تلویح بھی ایک قسم کا کنایہ ہے۔ اس کے لئے مطولات کی طرف متوجہ ہوں۔

علمِ بدیع

علمِ بدیع وہ علم ہے جس سے کلام کی خوبیاں معلوم ہوں مگر وہ خوبیاں لازمی نہ ہوں بلکہ آرائش کے طور پر ہوں۔ وہ دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک صنائع معنوی، دوم صنائع لفظی۔

صنائع معنوی

(۱) تضاد۔ دو ایسے لفظوں کا لانا جو آپس میں ضد ہوں جیسے زمین آسمان۔ پست۔ بلند۔ رات۔ دن۔

(۲) ایہام۔ ایک ایسا لفظ لانا جس کے دو معنی ہوں اور کسی قرینہ سے جو معنی وہاں فوراً سمجھ میں آتے ہوں وہ مقصود نہ ہوں بلکہ دوسرے

معنی مراد ہوں مثلاً "رنج واندوہ بڑھاتی ہے گھٹا ساون کی"۔ گھٹا کے دو معنی ہیں ایک ابر دوسرے بڑھا کی ضد۔ لفظ بڑھا کے سبب سے یہ شبہ پڑتا ہے کہ شاید بڑھا کی ضد ہے۔ لیکن شاعر کی مُراد بادل ہے۔

(۳) رجوع۔ ایک بات کہنا پھر اس کو ناقص سمجھ کر ترقی کرنا۔ جیسے "ماہ کامل صورت رو ہے مگر ابرو نہیں"

(۴) لف ونشر۔ چند چیزیں پہلے پھر اُن کی صفات یا خبریں یا اور کچھ بیان کریں۔ اس میں اگر ترتیب کا بھی لحاظ ہو تو مرتب ہے ورنہ غیر مرتب مثلاً۔ جب زید کے ہاتھ اور سر خوب ٹوٹیں اور پھوٹیں گے تو باز آئے گا۔ ہاتھ اور سر لف ہے اور ٹوٹنا اور پھوٹنا نشر۔ مگر یہ لف ونشر مرتب ہے اگر پہلے کو پہلے اور دوسرے کو دوسرے لفظ میں نسبت نہ ہوتی تو یہ لف ونشر غیر مرتب ہو جاتا جیسے سر اور ہاتھ ٹوٹے اور پھوٹے گا۔ سر سے پھوٹنا اور ہاتھ سے ٹوٹنا متعلق ہے یعنی لف کے پہلے لفظ کو نشر کے دوسرے لفظ سے تعلق ہے۔

(۵) مبالغہ۔ اوّل یہ کہ اگر عقل اور عادت دونوں کے موافق ہو وہ مبالغہ ارسال کہلاتا ہے۔ جیسے۔ جب کبھی رونے کو روکا درد سر ہونے لگا۔ عقل بھی تسلیم کرتی ہے اور عادت بھی ہے۔ دوم یہ کہ عقل تسلیم کرے مگر ویسا واقع نہ ہوا کرتا ہو جیسے گھوڑے کی تعریف میں کہیں کہ ایک دن میں ہزار کوس جاتا ہے۔ اس مبالغہ کو تبلیغ کہتے ہیں۔ سوم یہ ہے کہ عادت قبول کرے نہ عقل

مانے محض محال ہو جیسے گھوڑے کی تعریف میں کہیں کہ ایسا تیز ہے کہ اس کا نام لینے سے مسافر ہزار کوس چل سکتا ہے۔ جھوٹ اور مبالغہ میں یہ فرق ہے کہ جھوٹ میں جو الفاظ بولے جاتے ہیں ان کے اصلی معنی مراد ہوتے ہیں اور مبالغہ میں صرف کسی صفت کی کمی یا زیادتی مقصود ہوتی ہے۔

(۶) حسن تعلیل کسی امر کی وجہ بطور لطیفہ کے بیان کرنا جو اصل میں نہ ہو جیسے کہیں کہ شام کو جب تم سیر کو نکلتے ہو تو آفتاب شرما کر غروب ہو جاتا ہے۔ حالانکہ غروب کی وجہ اور ہے۔

(۷) توجیہ۔ اس طرح بیان کرنا کہ ہجو اور تعریف دونوں ہو سکیں جیسے
کیا ہی تاثیر ہے واللہ تری صحبت کی یک بیک لحظہ میں بن جاتا ہے احمق دانا

(۸) تلمیح۔ کسی مشہور قصہ کا اشارہ کر دینا۔ جیسے۔
طور کو نور کے جلوے میں جلایا اس نے کبھی آتش کو ہے گلزار بنایا اس نے
پہلے مصرعہ میں حضرت موسیٰ اور دوسرے میں حضرت ابراہیمؑ کے قصہ کا اشارہ ہے۔

(۹) سیاق اعداد۔ بالترتیب یا بے ترتیب اعداد کا کسی تقریب سے شعر میں لانا۔

(۱۰) تلمیع ایک مصرعہ ایک زبان کا دوسرا ایک زبان کا۔

(۱۱) ترجمہ۔ ایک زبان سے دوسری زبان میں کسی کے کلام کا ترجمہ کرنا (یہ صفت چوری نہیں ہے)

صنائع لفظی

(۱) تجنیس۔ تجنیسِ تام جیسے توڑا۔ بانوں کا زیور توڑا۔ روپوں کی تھیلی۔ تجنیسِ مرکب۔ ایک لفظ مرکب ہو دوسرا مفرد۔ جیسے کل آئی کلائی تجنیسِ محرّف۔ حروف یکساں تلفظ جدا جدا۔ جیسے گلے۔ گلہ کی جمع گلے گلا کی جمع۔ تجنیسِ خطی۔ اِملا یکساں نقطوں کا فرق۔ جیسے چین اور ختن اور بھی اس صفت کے چند اقسام ہیں۔ کتب مبسوط ملاحظہ ہوں۔

(۲) اشتقاق۔ ایک مادہ سے نکلے ہوئے الفاظ لانا جیسے قاتل اور مقتل۔ پری۔ پرندہ۔

(۳) منقاد۔ ایک مصرعہ کے آخر میں جو لفظ آئے دوسرے مصرعہ کے اوّل آتا جائے۔

(۴) لزوم۔ کسی لفظ کو اپنے اوپر لازم کرلینا اور ہر شعر یا ہر فقرہ میں لانا۔

(۵) قطع الحروف۔ ایسا کلام ترتیب دینا کہ اس کا کوئی حرف باہم ملا کر نہ لکھا جائے۔

(۶) منقوط۔ تمام حروف با نقطہ ہوں۔

(۷) مہملہ۔ تمام بے نقطہ ہوں۔

(۸) مرقطا۔ ایک حرف با نقطہ ایک بے نقطہ آخر تک۔

(۹) خیفا۔ ایک لفظ با نقطہ ایک بے نقطہ آخر تک۔

(۱۰) ترصیع۔ شعر کے تمام الفاظ آپس میں ہم وزن اور بالترتیب قافیہ ہوں۔ جیسے میرزا غالب مرحوم فرماتے ہیں۔

تیری دانش میری اصلاحِ مفاسد کی دلیل ✤ تیری بخشش میری انجاحِ مقاصد کی کفیل

(۱۱) توشیح۔ اشعار یا مصرعوں کے اوّل سے ایک ایک حرف لینے سے کچھ الفاظ یا عبارت نکلے۔

علمِ قافیہ

شعر یا مصرعوں کے آخر کے چند حروف اور اعراب کا نام قافیہ ہے اور مجازاً اس تمام لفظ کو قافیہ کہتے ہیں جس میں یہ حروف شامل ہوں جیسے قطعہ

کل اس خونخوار کی محفل میں ہم ہیں ✤ دل بیتاب مجھ کو کھینچ لایا

تو اُس نے یہ سمجھ کر منہ کو پھیرا ✤ کہ پھر بد نام کرنے والا آیا

یہ اس بات کی مثال ہے کہ قافیہ شعروں کے آخر میں ہے۔ مطلع اور

نوٹ ۔ میں نے صرف اسی قدر لکھا ہے جو ضروری ہے اور بے مدد استاد سمجھ میں آ جائے اور جی نہ گھبرائے۔ یہ کتاب واقف کاروں کے واسطے نہیں ہے بلکہ جن ناواقفوں کے کے لئے ہے کم ہمت یا عدیم الفرصت اس کے سبب سے واقف ہو جائیں گے بہت والے اور صحیح المذاق حضرات اس کے شوق میں حدائق البلاغت اردو یا فارسی یا راقم کی مبادی البلاغت تک بڑھ جائیں گے۔ اس کتاب کی ہر اک بات میں مشکل یا کم ضروری امور دانستہ ترک کر دئے ہیں۔

مثنوی کے اشعار میں مصرعوں کے آخر میں قافیہ ہوتا ہے۔ لایا اور آیا میں صرف آخر کا الف اور الف کے پہلے کی حرکت زبر قافیہ ہے۔ یا لایا اور آیا قافیہ ہے اور الف اور زبر حرف وحرکت قافیہ۔ قافیہ میں حروف اور حرکتیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک وہ جس کا ہر قافیہ میں لانا فرض ہوتا ہے جیسے لایا اور آیا میں آخر کا الف اور زبر۔ نظر اور قمر میں رائے بے نقط اور زبر۔ دوسرے وہ حروف اور حرکات جو بار بار ہر قافیہ میں لانے فرض نہ ہوں۔ اگر ان کی بھی رعایت کی جائے تو قافیہ خوب صورت معلوم ہو۔ بار بار نہ لائیں تو کوئی عیب نہ ہو جیسے لایا اور آیا میں یائے تحتانی اور اُس سے پہلے کا الف۔ پس اگر لایا کا قافیہ آیا، پایا، کھایا ہو تو بہت اچھا ورنہ لایا کا قافیہ سودا، دریا بھی درست ہے۔ اب یہ شناخت کہ کون سے حروف بار بار لانے فرض اور کون سے اختیاری ہیں۔ اِس کا یہ قاعدہ ہے کہ قافیہ کے آخر کا حرف دیکھا۔ اس سے پہلے جو جو حروف ساکن ہوں گے۔ وہ اور اُن کے ماقبل کی حرکت ہر قافیہ میں ضرور پلٹ پلٹ کر آئے گی۔ نور کا قافیہ طور۔ حور درست اور غور نا درست ہے۔ اس لئے کہ رائے بے نقطہ آخر کا حرف اس سے پہلے صرف واؤ ساکن ہے اور اُس سے پہلے پیش۔ لہذا ہر قافیہ میں اس کا لانا فرض ہے۔ غور میں واؤ سے پہلے زبر آگیا اس لئے یہ قافیہ غلط ہے۔ تخت کا قافیہ سخت

اور بخت درست ہے اور رفت غلط ہے۔ اس لئے کہ رفت میں تا کے
پہلے فا ہے اور ہونی چاہئے تھی خا۔ دوست کا پوست درست اور گوشت
نادرست ہے۔ کاشت کا واشت درست اور بافت نادرست ہے۔
آخری حرف کو اس فن کی اصطلاح میں حرف روی کہتے ہیں۔ وہ اور
اس کے اوّل کے حرف ساکن ایک ہوں یا زیادہ ہر قافیہ میں اُن کا اور
اُن کے ماقبل ایک حرکت لانا بار بار ضرور ہے۔ لیکن آخری حرف سے مراد
وہ حرف ہے جو لفظ کا اصلی آخری حرف ہو جیسے حوراں۔ اس میں قافیہ
کے مقصد کی غرض سے نون آخری حرف نہیں ہے بلکہ یہ جمع کی علامت
کا ایک حصّہ ہے۔ اس لئے حرف جو آخر میں ہے وہ را مہملہ ہے۔ اور
اسی کا نام حرف روی ہے۔ اسی کے ماقبل کے ساکن حروف بار بار ہر
قافیہ میں آتے ہیں۔ اور حرف روی کے بعد جو حرف آتے ہیں اُن کا
ہر قافیہ میں لانا بھی ویسا ہی فرض ہے جیسے روی کے ماقبل کی سکون
کا ہر قافیہ میں لانا۔ پس بارہا کا قافیہ کارہا اور دیارہا درست ہے مگر
یہ بھی درست ہے کہ چند قافیوں میں حرف روی حرف اصلی ہو اور ایک
دو قافیوں میں اصلی نہ ہو جیسے سلیماں۔ درباں قافیے ہیں اس میں
حوراں بھی لکھ دیا تاہم درست ہے۔
قافیہ ہے کیا۔ دریا۔ صنفا قافیہ باندھ دیا بارہا۔ حوراں کا نون

اصلی نہیں اور یارہا کا الف اصلی نہیں بلکہ علامت جمع کا ایک حصہ ہیں
چونکہ اصلی حرف روی کے مقابلہ میں آیا ہے اصلی کے برابر ہو گیا۔
اور اگر دونوں قافیوں میں آخر حرف زائد ہو اور ایک ہی معنی میں
دونوں قافیوں میں تکرار کرے اور اگر وہ حصہ جس کا حرف روی ایک
حصہ سے نکال ڈالیں تو بقیہ اصلی لفظ آپس میں قافیہ نہ رہیں یا آپس
میں تو قافیہ رہیں مگر اور قوافی کے خلاف ہو جائیں تو یہ عیب ہے
اور اس کو ایطا کہتے ہیں۔ جیسے ایک غزل ہے اس کے قافیہ ہیں اکثر
انور، قمر، اس میں آگیا ستمگر۔ درست ہے۔ اگرچہ ستمگر کی رار بے نقطہ
حرف اصلی نہیں ہے۔ مگر اور قافیوں میں تو رار اصلی ہے۔ ستمگر کی
رار وصلی بھی اصلی کے ساتھ اصلی سمجھی گئی۔ اسی غزل میں مطلع کہا
جس کا ایک قافیہ ستمگر دوسرا جفاگر ہے تو یہ نا درست ہے اس لئے
کہ 'گر' دونوں جگہ ایک ہی طرح فاعلی معنی میں ہیں۔ رار جو حرف
روی ہے وہ ایک جگہ بھی اصلی نہیں۔ مگر جو زائد حصہ ہے اس کو دونوں
جگہ سے نکال دیا تو ستم اور جفا رہ گیا۔ اب بقیہ جو رہا وہ قافیہ نہ رہا
اس لئے یہ قوافی غلط ہیں اور اس عیب کا نام ایطا ہے۔ اسی طرح
دوسرے مطلع میں بمقابلہ نظر، قمر کے ایک مصرعہ میں کیمیاگر دوسرے
مصرعہ میں جفاگر ہے اس میں بھی وہی ایطا ہے کیونکہ جب دونوں قافیوں

میں سے گڑ نکال لیا تو جفا اور کیمیا رہ گیا۔ یہ آپس میں تو قافیہ اب بھی ہیں مگر قمر، نظر کا قافیہ نہ رہا۔ اس لئے ایسی غزل میں یہ مطلع بھی عیب دار ہے۔ البتہ اگر تمام غزل میں ؛ گر، حرف فاعلیت اور جفا کیمیا کا الف حرف روی ہوتا تو بھی درست تھا۔ جیسے کیمیاگر، جفاگر، نواگر تو تیاگر تو درست ہوتا۔ ایسے قوافی میں ایسا قافیہ بھی درست ہے کہ جس کا ؛گر، اس معنی میں نہ ہو مگر لفظ کی شکل ایسی ہی ہو جیسے شہر کا نام ساگر ہے۔ خواب جواب قافیوں میں جہاں تاب بھی درست ہے مگر ایک مطلع میں جہاں تاب اور ماہتاب غلط ہے کیونکہ تاب دونوں جگہ ایک ہی معنی میں ہے۔ دریا، صہبا کا قافیہ دانا درست ہے مگر دانا کا قافیہ بینا مطلع میں عیب دار قافیہ ہے کیونکہ دریا کا الف اصلی ہے اس کے ساتھ دانا کا الف فاعلی بھی اصلی سمجھا گیا۔ لیکن دانا اور بینا اس لئے نادرست اور بیمار قافیہ ہے کہ دونوں کا الف جو حرف روی ہے وہ اصلی نہیں علاوہ ازیں ایک ہی معنی میں مکرّر آیا ہے دونوں میں الف فاعلی ہے اور بقیہ جو حصہ رہا وہ داں اور بیں ہے اور آپس میں قافیہ نہیں۔ اسی طرح اردو میں بھی قیاس کرنا چاہئے۔ اور اگر حرف روی کے پہلے کوئی ساکن حرف نہ ہو تو صرف ایک حرف اور اس کے پہلے کی حرکت واجب التکرار ہوتی ہے جیسے قضا، ادا۔ سحر، نظر، چمن، رسن۔ ان

قوافی میں آخر میں ایک حرف ساکن ہے اور اس کے پہلے زبر پس
وہ زبر اور آخر کا حرف ساکن سب قوافی میں آئے گا اور باقی حرفوں
کا ہر قافیہ میں بار بار آنا ضروری نہیں۔ پس قضا کا قافیہ رضا، مضا،
فضا۔ ضا دکی قید کے ساتھ لانا فرض نہیں اگر کوئی اپنے اوپر فرض
سمجھ لے تو خوب صورت ہے۔ اگر حرف روی میں اضافت یا کسی
حرف کے ملنے سے حرکت پیدا ہو جائے جیسے بہار، مزار۔ بہار دل
ہو جائے تو ایسی حالت میں روی کے پہلے کی حرکت یا روی سے پہلے ساکن
کے ماقبل کی حرکت کا اختلاف داخل عیب نہیں رہتا۔ جیسے ظالم کا
قافیہ قائم ہے اور جس قدر قافیئے ہوں گے میم کے پہلے زیر ہوگا لیکن
اگر میم کسی اور حرف سے مل کر متحرک ہو جائے تو میم کے اول کے زیر کا
اختلاف درست ہو جائے گا۔ شیخ شیرازی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں۔

چو خواہد کہ ویراں کند عالمے دہد ملک در پنجۂ ظالمے

اسی قاعدہ کی بنا پر شاعر اور داور قافیہ غلط اور شاعری داوری
درست۔ چشت، گشت غلط۔ چشتی، گشتی درست۔ سُفت، رفت غلط۔
سُفتم، رفتم درست۔ دیکھو سعدی خاقانی کے قصائد۔

مذکورۂ بالا قواعد سے ظاہر ہے کہ صندوق کا قافیہ نون کی قید
سے بندوق وغیرہ فرض نہیں۔ آخر کا قاف حرف روی اُس کے پہلے کا

حرف ساکن حرف واوٗ اور واوٗ کے پہلے کی حرکت پیش ہر قافیہ میں ہونا لازم ہے۔ تمام الفاظ جو آپس میں قافیہ ہوتے ہیں تین طرح ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ لفظ بھی جدا جدا۔ اُن کے معنی بھی جدا جدا۔ جیسے آسمان، مکان۔ دوسرے دیکھنے میں لفظ علیحدہ علیحدہ مگر معنی ایک جیسے زبان، لسان۔ تیسرے لفظ تو وہی مگر معنی جدا جدا۔ جیسے بار۔ ایک جگہ پھل اور دوسری جگہ بوجھ کے معنی ہیں۔

اقسامِ نظم

نظم کی دس قسمیں ہیں۔ فرد، غزل، قصیدہ، تشبیب، رباعی، قطعہ، مثنوی، ترجیع بند، مسمط، مستزاد۔

فرد۔ ایک شعر۔ غزل۔ مطلع مقطع اور چند طاق اشعار کا مجموعہ اور جو کچھ اس کے اشعار کا اندازہ کیا گیا ہے اس پر کسی کا عمل درآمد نہیں۔

قصیدہ۔ اس میں مطلع مقطع اور درمیانی اشعار غزل کی ترکیب کے موافق ہوتے ہیں مگر غزل میں چند مطلعے بلا فصل آسکتے ہیں قصیدہ میں

نوٹ: فن قافیہ میں بھی میں نے وہی حصہ بیان کیا ہے جو روزمرہ کام میں آتا ہے اور نہ جاننے سے کہیں حیرت کہیں خطا ہوتی ہے۔ بیان کا طریقہ بھی مصطلحات سے بچ کر عامیانہ اختیار کیا ہے تاکہ میرے مخاطب سمجھیں لہٰذا منتہی نام نہ رکھیں۔

نہیں لاتے اور مضمون کے لحاظ سے ایک جداگانہ قسم ہے قصیدہ میں کم ازکم بیس سے زیادہ اشعار ہوں تو بہتر ہے۔ اس میں مضمون دقیق معانی بلند شوکت الفاظ زیادہ صنائع بدائع کا استعمال مناسب چاہئے۔ قصیدہ اپنی ردیف یا قافیہ یا مضمون کے لحاظ سے موسوم ہوتا ہے۔ لام کا قافیہ ہے لامیہ آفتاب ردیف ہے شمسیہ بہار کا ذکر ہے تو بہاریہ اپنی تعریف ہے تو فخریہ۔ ترتیب اشعار یوں ہوتی ہے کہ

(۱) تشبیب یا تمہید۔ گریز (جہاں سے مدح شروع ہو) غیبت، خطاب، مدّعا، دعا، خاتمہ۔

(۲) مدح غائب (غیبت) مدح حاضر (خطاب) مدّعا یا کچھ اور دعا۔ خاتمہ۔

(۳) تمہید، مدح غائب، خاتمہ، دعا۔

(۴) مدح غائب، خاتمہ، دعا۔

(۵) مدح حاضر۔ دعا، خاتمہ۔

(۶) صرف حمد۔ (۷) صرف نعت (۸) صرف واقعات۔

(۹) صرف پند (۱۰) صرف مرثیہ (۱۱) صرف منقبت (۱۲) صرف شکایت زمانہ اور ہر قسم کے مضامین غرض یہ کہ غزل سے اس میں اشعار بھی زیادہ ہوتے ہیں اور جس مضمون کو چاہیں لکھ سکتے ہیں۔

تشبیب۔ قصیدہ کا بہاریہ حصہ جو اول ہوتا ہے جس میں بہار،
شباب، مستی رندی، شراب، کباب کا ذکر ہوتا ہے۔

رباعی۔ ایک مطلع ایک شعر یا دونوں مطلعے مگر جہاں تک ہو سکے
مضمون چست اور چوتھا مصرعہ سب سے عمدہ۔ رباعی کے لئے خاص
وزن مقرر ہیں۔ ہر وزن میں رباعی نہیں کہہ سکتے۔ ہاں رباعی کے بعض
وزن غزل قصیدہ میں برتے جاتے ہیں۔ مگر اس قدر مشکل بھی نہیں
ہے جس قدر مشکل سمجھ لیا ہے" لاحول ولاقوۃ الا باللہ"۔ یہی اگر آدمی
سو پچاس بار کہے تو رباعی کے اس وزن پر قادر ہو جائے۔ اور جو
عروض داں نہ ہو اسی کو طرح سمجھے۔

قطعہ۔ دو یا چند اشعار جن کا وزن قافیہ ردیف غزل اور
قصیدہ کی طرح ایک ہو مگر اشعار کا مضمون آپس میں ملا ہوا ہو مطلع
ہو یا نہ ہو۔

مثنوی۔ ہر شعر کے دو مصرعوں کا قافیہ باہم موافق ہو وزن
جس کا ایک ہو۔ تعداد دو شعروں سے زیادہ خواہ کتنے ہی ہوں
جیسے بوستاں، سکندر نامہ، شاہ نامہ۔

ترجیع بند۔ اگر چند شعر ہم وزن ردیف قافیہ میں موافق کہیں
اور ان کے بعد ایک ہم وزن شعر جس کا قافیہ ردیف جدا ہو لگا دیں

تو یہ بند ہوا اور اسی طرح چند بند یک جا ہوں تو وہ ترکیب بند ہے۔
اور اگر ہر بند کے بعد نیا شعر نہ کہیں۔ صرف پہلے بند کے لئے جو شعر آخر کا کہا تھا ہر بند کے آخر میں لاتے جائیں تو وہ ترجیع بند ہے۔

مسمّط۔ اس کی سات قسمیں ہیں۔ مربع، مخمس، مسدس، مسبع، مثمن، متسع، معشر۔ چار چار مصرعوں کا بند ہو تو مربع ہے۔ پانچ پانچ مصرعوں کا بند ہو تو مخمس چھ چھ مصرعوں کا بند ہو تو مسدس۔ سات سات مصرعوں کا بند ہو تو مسبع۔ آٹھ آٹھ مصرعوں کا بند ہو تو مثمن، نو نو کا بند ہو تو متسع۔ دس دس مصرعوں کا بند ہو تو وہ معشر ہے۔

مستزاد رباعی کے ہر مصرعہ کے آخر میں ایک حصہ وزن رباعی کا لاتے ہیں۔ متاخرین نے غزل کو بھی مستزاد کہا ہے۔ اس کے کئی طریقے ہیں غیر ضروری جان کر ترک کیا۔

یہاں سے اب ضروری بحث غزل کے متعلق پھر شروع کی جاتی ہے کہ شاید کسی بندۂ خدا کو مفید ہو۔ یہ بڑے محقق شاعری کا تجربہ اور رائے ہے اور میں نے مناسب کتاب ترمیم و اسقاط بھی کیا ہے۔

غزل کے مضامین

غزل میں بیشتر عشقیہ مضامین ہونے چاہئیں کیونکہ عاشقانہ

مضامین غزل کی جان اور روزمرّہ اور محاورہ اس کا جسم ہے۔ اگر ان میں کمی ہوئی تو غزل کی غزلیت میں کمی آگئی۔ عالی یا افسردہ مضامین کے لئے قصیدہ اور قطعہ کیا کم ہیں جو غزل کا خاکہ اڑایا جائے۔ اگرچہ اور مضامین بھی ممنوع نہیں لیکن کثرت سے عاشقانہ کی ضرورت ہے۔ جو شعراء اس راہ سے منحرف ہوئے ہیں ان کا کلام کم رائج ہے اور قبولیت عامہ نے شوق کی نظر سے نہیں دیکھا۔ مناسب تو یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے مضامین کی بنا اصلیت پر رکھی جائے تاکہ جو کچھ منہ سے نکلے دلوں میں سرایت کرے اور شاعر اس مضمون کے لطیف اور باطنی پہلوؤں کو لکھ سکے اور کلام کو شاعر کی عمر، مذہب، صورت، خدمت، مزاج، پیشہ، رتبہ اور جمیع تعلقات سے مناسبت ہو ورنہ یہ دقتیں پیش آئیں گی۔

(۱) مثلاً اگر شاعر عاشق نہیں ہے تو صرف الفاظ کا ادا کرنا ایسا ہے جیسے بھانڈ قیس یا فرہاد کی نقل کرے اور اگر قائل کی حالت اس کے قول کی تکذیب بھی کرتی گئی تو نقل میں بھی نقص رہ گیا۔ مثلاً ایک جوگی بنا اور مرگ چھالا لے کر بادشاہوں کی صورت سے اپنے آپ کو مشابہ کرے تو ہنسی نہ آئے گی تو اور کیا ہوگا۔ اسی طرح ایک تماشہ پیراستہ دلش و خرم شخص مصیبت اور پریشانی کے مضامین کہے تو کیا اس جگی

سے مشابہ نہیں اور اس کی حالت اس کے قول کی تکذیب نہیں کر رہی۔ اسی طرح ایک راشی شراب خوار صبر و رضا اور ترک دنیا کے مضامین لکھنے والا اچھا خاصہ بیوقوف بہروپیا ہے۔ ایک نوجوان مرد جس کو ابھی بالغ ہوئے ہفتہ بھر بھی مشکل سے ہوا ہوگا۔ ڈاڑھی مونچھ سے معرّا مردانہ درشتی سے مبرّا پرانے گنہگاروں جیسی باتیں کرے جنہوں نے صدہا معشوقوں کے ابھارسے ڈھلاؤ تک سیر کی ہے تو بے تحاشا ہنسی آئے گی اور یہ معلوم ہوگا کہ بندر آدمی کی سی حرکتیں کر رہا ہے۔ یا ایک سو برس کی عمر کا بزرگوار ضعف پیری جس کے گلے کا ہار ہے۔ الفت کے تمہیدی مضامین لکھے تو کہا جائے گا نانا دانت تو ٹوٹ گئے یہ لوہے کے چنے تمہارے عوض کون چبائے گا۔ کہ پیر خود نتواند زگوشہ برخواست یا ایک جبّہ باز ریش دراز متقی دستار مسجع گفتار مولانا شراب کباب رندی اوباشی کے مضامین پڑھیں گے تو یہی شبہ ہوگا کہ یا لباس مانگے کا ہے یا غزل چوری کی۔ یا ایک قوی جوان جس کو ضعف کا سان گمان بھی نہیں ہے ضعف پیری کے مضامین لکھے تو سمجھا جائے گا کہ بھانڈ مستی نے بڑھیا کا روپ بھرا ہے اور وہ بھی ادھورا۔ یا کوئی بڈھا جوانی کی بانگ بے ہنگام لگائے تو سمجھا جائے گا کہ ایک بوالہوس نے خضاب کیا ہے تو وہ بھی بدرنگ۔ مگر افسوس یہ طریقہ اس ملک میں چل نکلا ہے

جہاں سچ مچ شاعری مقصود ہو۔ ہمارے ملک میں تو شاعری سے یہ
مقصد ہی نہیں ہوتا بلکہ کسی کو اظہار لیاقت کسی کو اظہار مشق کسی کو اظہار
فن کسی کو تعمیل حکم کسی کو شرکت جلسہ کسی کو لطف صحبت کسی کو اوقات
گزاری کسی کو شہرت کسی کو کمائی کسی کو رسائی کسی کو محض تضیع اوقات
مقصود ہے تو میرے نزدیک ان ضرورتوں میں اصلیت پر مضامین کے
بنا رکھنا گویا شاعری کے دروازہ پر تیغا لگانا ہے۔ ہاں اپنے اور موقع
کے مناسبات کا لحاظ رکھنے اور خیال رہے کہ اگر محض فرضی مضامین محض
تقلیداً بھی لکھے جائیں تو طرز پُر اثر پیرایہ نہایت ہی اصل سے مشابہ
ہم اسلوب علیحدہ، طریقہ اچھوتا، زبان نہ ملایانہ نہ بازاری، روزمرہ درست
محاورات برمحل، چست الفاظ، بے ساختہ شستہ جملے کہ نہ حرف
دبے نہ زبان اُلجھے تاکہ سماعت پر بار اور سمجھنا دشوار نہ ہو۔ نہ ہاں کے
ظاہر داری اور بناوٹ کی ہجو ہو تاکہ معلوم ہو کہ پورا نیک نہ ہونے کی
وجہ سے حملہ کیا گیا ہے۔ لیکن ان کی ذات پر حملہ نہ کرے ورنہ کہا جائے گا
کہ نیکوں پر اس لئے حملہ کیا گیا ہے کہ وہ پورے نیک کیوں ہیں اور یہی
امر قانون دین و دنیا کے خلاف ہے۔ یہ صحیح نہیں کہ جو مضامین اگلوں
نے لکھے ہوں بلا ترمیم بغیر لحاظ مناسبت ہم بھی لکھے جائیں اور معزز
لقب خوش نویسی کے مستحق ہوں۔ کسی استاد نے جو نائی کا مضمون لکھا

ہو تو کیا فرض ہے کہ ہم محض تقلیداً اپنے وفادار معشوق کو بھی بیوفا ہی بتائیں۔ کسی نے عالمِ افلاس میں اپنی حالتِ بے سامانی لکھی ہو تو ایک امیر بھی بجائے شکر نعمت کے بیٹھا پیٹ کو رویا کرے۔ کیا فرض ہے کہ ایک فقیر نے امرا کو دنیا کا کتا بنایا ہو تو ایک امیر کا مصاحب بھی یہی مضمون باندھ کر ٹکٹکی سے باندھا جائے۔ ایک یورپ کے تعلیم یافتہ نے کہا ہو کہ بی بی کا ہاتھ پکڑ کر باغ کی سیر میں مزا آتا ہے۔ تو ایک شریف آدمی شرع شریف کا پابند بھی جس کو یہ مفروضہ تہذیب اور عیسویت کی ہوا تک نہ لگی ہو وہ بھی یہی کہے۔ استغفراللہ یہ مسخراپن نہیں تو اور کیا ہے۔ ہر حال میں اپنی مناسبتوں کا لحاظ سب سے زیادہ مقدم ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمارے منہ سے وہی صدا نکلے جو ہمارے دل سے اٹھی ہو نہ کہ ہم گنبد بن جائیں کہ جو کچھ کوئی اور کہے اس کے سوا کچھ نہ کہہ سکیں۔ بر تقدیر یہ ہمارے دل سے اٹھی ہوئی صدا نہ ہو تو بھی ایسی کوشش تو ضرور کی جائے کہ دل سے اٹھی ہوئی صدا معلوم ہو۔

غزل میں بھی بے حد مضامین بندھ سکتے ہیں مثلاً شوق، نامہ و پیام ملاقات کی تمنا، ملاقات، اقربا کا خوف، معشوق کے عزیزوں سے اخفا، ان کی رخنہ اندازی، یا اس امر کا خوف، اغیار کا دھڑکا، محتسب کا کھٹکا

معشوق کا ملنا، موافقت، یک دلی، نجاؤ یا لگاؤ، یک جائی، لطفِ وصال، باغوں کی سیر، شبِ ماہ کا لطف، ہم آغوشی، بے تکلفی، ہاتھا پائی، معشوق کی بے اعتنائی، استغنا، صاف جواب، نامہ بر پر خفگی، پارسائی، شرم، حجاب، بے توجہی، منت، اس کی سخت جوابی، رنج نا امیدی، بے قراری، اضطراب، رشک، دوانی، کامیابی یا ناکامی، دردِ فراق، شوقِ وصال، بدگمانی۔

شراب و کباب، جوانی کا جوش، یاروں کی صحبتیں، جلسے، محفل آرائی، دیوانہ حرکات، مستی کے ولولے، راگ، رنگ، بربط و چنگ، دنیا و ما فیہا سے بے غمی، سامان عیش کی فراہمی، شحنہ سے بے خوفی، واعظ سے نفرت، شیخ کی حقارت و عداوت، بارش کا موسم، سبزہ زار، بلبلوں کا ہجوم، قمریوں کی کوکو، طوطیوں کی نغمہ سرائی، صبا کی روانی، حوض کی لبریزی، نہروں کی موج خیزی، فوارہ کی گوہر افشانی، پرندوں کا ہجوم، مرغانِ نواسنج کا بولنا، نسیم کی مستانہ روش، سرو کی قطار بندی، چنار کی بلندی، خوشبو کا انتشار، پھولوں کا مہکنا، شاخوں کا لچکنا، سبزہ کی لہک، گل و سنبل کی مہک۔

خزاں، پتوں کی زردی، ہوا کی پریشان رفتاری، بلبل کی خاموشی، گلوں کا پژمردہ ہونا، تنہائی کا سناٹا۔ شاخوں کی برہنگی، سردی کا

جوش، ژالہ باری، جوانی، رندانہ خیالات، ماضی و مستقبل کی فراموشی، سیر و شکار، قدرتی منظر، فطری جذبات، حسن پر فوری میلان، غماز انداز، اخلاص، علم کی بے قدری، زمانہ کی سفلہ پروری، اہلِ زمانہ کا رشک، خوشامد کا رواج، اہلِ علم کی خستہ حالی، ہم عصروں کی نااہلی، اقربا کی مخالفت، زمانہ کی عدم موافقت، منصوبوں کا بن بن کر بگڑنا، فراق، دردِ جدائی، دشت پیمائی، آوارگی، نالہ، آہ، فریاد، وحشت، تنہا پسندی، گوشہ گزینی، شکایت اغیار، شکوہ آسمان، تمنائے نامہ بر، گلہ مقدر، آرزوئے رازداں، منت پاسباں۔

عمر، جوانی کا جوش و خروش، حوصلہ مندی، خیالات کی بلندی، سب سے بے پروائی، آئندہ ترقی کے ولولے، عشق و حسن کے کرشمے، پیری، ضعف قویٰ، دنیا کا تجربہ، عالم کی بے ثباتی، دولت کی بےوفائی، اہلِ زمانہ کا منافقانہ برتاؤ، دوست کی کم یابی، دوستی کے فوائد، عاقبت کا خیال، گزشتہ کا افسوس و ملال، آئندہ کا بندوبست، موت کا خیال، قبر کا جاں خراش تذکرہ، گور کی تنہائی، فرشتوں کے سوال و جواب، اعمال کی پرسش، ہمیشہ کا خواب راحت یا دائمی عذاب و زحمت۔

بیماری اور دوراقربا کی جدائی، اسباب دنیا کا حالتِ بے اختیاری میں چھوڑ جانا، گناہوں پر نادم ہونا، معاصی پر خجالت سے رونا، توبہ

آمادگی یا گناہوں پر اصرار، یادالٰہی کا ذوق، روزہ نماز کا شوق، حب اللہ
اس کے علاوہ باقی ہوس، خوشی، غم، حسرت، ندامت، شکر، شکایت
سبب، صبر ورضا، قناعت، توکل، رغبت، نفرت، رحم، انصاف،
غصہ، تعجب، امید، یاس، شوق، انتظار، حب وطن، قومی ہمدردی،
رجوع الی اللہ، حمایت دین ومذہب، دنیا کی بے ثباتی۔

اس کے علاوہ صدہا جذبات اور کیفیات جو نفس پر وارد ہوتے
اور گزرتے ہیں لکھے جا سکتے ہیں۔ صرف ذرا خیال میں وسعت اور مزاج
میں بہت اور اندھی تقلید سے نفرت ہو لیکن کچھ ہی کیوں نہ کہیئے۔
کلام غزل سرائے میں غزلیت سے باہر نہ ہونے پائے۔ بجائے اس کے
اگر چند ہی مضامین میں غزلیت کو محدود کر دیا جائے تو جب ہر مضمون کے
اسلوب تمام ہو جائیں گے تو بجائے تازگی کے اعادہ اور تکرار شروع
ہو جائے گی اور صرف ردیف، قافیہ اور وزن کا اختلاف زیادہ غرابت
اور جدت نہیں پیدا کر سکتا۔ بہروپیا جب تک نئے نئے روپ بھر کر لاتا
ہے بشاشت اور تعجب دونوں پیدا ہوتے ہیں۔ مگر جب پلٹ پلٹ کر
وہی روپ آنے شروع ہوتے ہیں تو آنکھ اٹھا کر دیکھنے کو بھی جی
نہیں چاہتا۔ صرف طرح کا اختلاف اسی قدر تفاوت پیدا کرتا ہے جیسے
کھانڈ کے کھلونوں کا سانچہ کہ شکل جدا جدا مگر مادہ اور مزا ایک غزل میں

صفائی کا از حد لحاظ ہے کیونکہ یہ گلدستہ ہے۔ اس میں کانٹوں کی گنجائش نہیں۔ ہاں قصیدہ ایک گلزار ہے جس میں سبزہ زار بھی ہے اور سر بفلک کشیدہ اشجار بھی۔ کہیں گل ہیں اور گلوں میں خار کہیں نہریں اور نہروں میں آبشار۔ غزل کو خاص پسند بنانے کی بہ نسبت عام پسند بنانا بہتر ہے اور قصیدہ کو اس کے خلاف۔ اور اس کی یہ ترکیب ہے کہ عاشقانہ مضامین، عام دلوں میں آنے والے خیالات، مضمون جدید ورنہ اسلوب عمدہ، الفاظ شوخ۔ جن خیالات کی طرف عام طبائع کا میلان ہو وہ معاملات لکھ کر عام دلچسپی حاصل کی جائے تاکہ نہ سماعت پر بار ہو نہ یاد کر لینا دشوار۔ مضمون میں جہاں تک ہو تعمیم سے کام لیا جائے۔ مثلاً یہ مضمون کہ۔

جس انسان کو معشوقوں کی محبت نہ ہو وہ پتھر ہے' یوں عام کر دیا جائے کہ جس کو محبت نہ ہو وہ پتھر ہے۔ پہلی صورت میں اس کا صرف عاشق و معشوق ہی تک تعلق تھا اور اب اس درجہ وسعت پیدا ہو گئی کہ آپ کا شعر ماں، بیٹی، باپ بیٹے، میاں بی بی، آقا نوکر، شاگرد و استاد، پیر مرید، حتیٰ کہ بندہ اور خدا سب کی باہمی نسبت کا بیان ہو گیا اور صدہا موقعوں کی مناسبت پیدا ہو گئی۔

غیر مانوس الفاظ سے اس قدر بچنا چاہئے کہ عیب واہمہ سے ہے

شعر کا نہ ہونا لاکھ درجے بہتر ہے جب زر کے عوض جب ذہب تیغزا یا اسد اللہ کی جگہ ضیغم صمد کی ضرورت نہیں۔ ایسے امور میں استادوں کی سند کے بھروسہ بے فکر نہ ہو۔ وہ استاد تھے اُن کا نام بھی ادب سے لیا جاتا ہے مگر آپ سے کوئی درگزر نہ کرے گا ہمیشہ خوبیوں میں اساتذہ کی تقلید کیجئے اور ان کی ایسی مسامحتوں کو خدا کے حوالہ کیجئے اور جہاں اور کلام کے عیوب یاد رکھے ہیں یہ بھی ایک عیب جان لیجئے کہ جو کلام روزمرہ اور قاعدہ سے اتنا دور جا پڑے کہ سند کے سوا مقبول ہی نہ ہو سکے یہ بھی خود ایک نقص ہے اور اس شعر کو اس آدمی کی مانند جانئے جو بدنام ہو مگر جرم ثابت نہ ہونے دے۔

فارسی تراکیب سے شوکت الفاظ پیدا کیجئے مگر نہ کہ اس قدر کہ شعر اضافتوں کا بار بن جائے۔ ایک اضافت بہت خوبصورت، دو خوب صورت، تین متواتر بدنما، چار بدرجۂ لاچاری جائز۔ اور اس سے زیادہ کلام کو فصاحت سے خارج کر دیتی ہیں عربی لغلت بہت مستعمل ہیں اور کلام کی متانت وزن دار ہونے میں ایک خاص اثر ہے مگر نہ اس قدر کہ کلام گنجلک ہو جائے اور حروف حلقی کا گلے میں پھندا پڑ جائے۔

تشبیہ سے عقلی چیزوں کو قریب الفہم اور مؤثر بنانا لازم ہے۔

جیسے علم کی تشبیہ شمع سے موت کی تشبیہ اژدہے سے حسی چیزوں کو عقلی چیزوں سے تشبیہ دے کر نادر و قابل قدر اور لائق عزت ثابت کرنا چاہئے جیسے قد کی تشبیہ قیامت سے۔ عارض کی تشبیہ نور خدا سے۔

استعارات سے مناسبات پیدا ہوتے ہیں۔ محاورات اکثر اسی لباس میں پوشیدہ ہیں۔ کلام میں رونق اور وسعت بھی اسی سے آتی ہے۔

کنایہ سے کلام میں وسعت اور بلاغت پیدا ہوتی ہے۔ اور بلاغت کا قاعدہ ہے کہ کنایہ صراحت سے زیادہ بلیغ ہوتا ہے۔

مجاز کے بھی اکثر فائدے وہی ہیں جو اوپر بیان ہوئے اور جو لوگ صراحت پر بے حد عاشق ہیں خود پوچ ہیں اور ایسوں ہی کے مقبول کی اہل علم میں وقعت نہیں ہے۔

صنائع بدائع جو بے تکلف آپڑیں سبحان اللہ جو شعر کو شعریت سے کھودیں اُن پر لعنت اللہ۔ صنائع کے درپے ہونے سے اکثر معنی کا سلسلہ بے ربط ہوجاتا ہے۔ شعراء دو قسم کے ہیں ایک نہایت پُرتکلف، اُن کے اشعار واہ کے طالب ہیں اور ایک فرقہ نہایت بے تکلف اُن کے اشعار آہ کے حق دار۔ اگر غور سے دیکھئے تو

معلوم ہوگا کہ واہ والے محض تماشا ہیں اور آہ والے صاحب تاثیر۔
واہ والوں کا قبضہ صرف زبانوں پر ہے اور آہ والوں کا سکہ دلوں پر
چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔

عروض

مقدمہ

میرا ارادہ تھا کہ محبوب الشعراء کے اس حصہ میں کچھ اور
لکھوں مگر مرشد زادوں کے ارشاد سے جن کے آستانہ کی
خاک عبیر اور جن کی راہ کی گرد میرے نزدیک اکسیر ہے اپنا
قصد بدل دیا اور عروض لکھنا شروع کیا۔ اس سے پہلے
فن کے ضروری مسائل عامیانہ طور سے بیان ہوئے
ہیں مگر اس میں قدرے شرح وبسط سے کام لوں گا تاہم
طالب علمانہ مباحث سے اجتناب اور اختلافات سے
احتراز ہوگا۔ ضروری امور متن میں نیم ضروری حواشی پر اور
غیر ضروری ترک کر دوں گا

اس کی نسبت میری رائے

جن صاحبوں کی طبیعت موزوں ہو یا موزوں ہو چکی ہو

اور غزل تک ان کی شاعری کا قدم پڑتا ہو۔ ان کو معمولی بحروں میں عروض کی کہیں ضرورت نہیں اور ظاہر ہے کہ مشاعرہ میں عروض داں کم ہوتے ہیں۔ تاہم عروض جاننے والوں کا کلام اُن سے کچھ کم موزوں نہیں ہوتا۔ البتہ ناموزونیت کا شبہ پڑ جائے تو رفع نہیں ہوتا۔ اور حریف کے مقابلہ میں تقطیع کرتے وقت خفت ہوتی ہے۔ اور خطا تو بعض خاص وزنوں میں بھی ہو جاتی ہے۔ ورنہ غزل میں صرف موزوں طبیعی سے کام نکل جاتا ہے۔

البتہ جو موزوں طبع نہیں ہیں یا مزاولت نے موزونیت تک نہیں پہنچایا یا اُن کے لئے عروض بہت ضروری اور مفید ہے۔ یا ان صاحبوں کو جو مشق کی برکت سے عمدہ درجہ تک پہنچ گئے ہیں اور عروض سے ناواقف ہیں تاکہ ان کا سکہ مانا جائے اور ہر کس و ناکس منہ نہ آئے۔

غزل کو سب سے پہلے موزونیت کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد اُن اسباب کی جن کا اس کو بھلا یا بُرا ذکر کرنا ہے۔ ورنہ اس کے ذہن کی بات اندھے کی ٹٹول سے کچھ زیادہ وقعت دار نہ ہوگی۔ پھر اگر ضرورت ہے تو حد سے زیادہ